سخت برواز دل گذرد و ہر کہ ز پیشم
من قماش فروش دل صد پارہ خویشم

پارۂ دل

باپ کا خط بیٹے کے نام

مُصَنَّفہٗ

سیّد محمّد انور (محقق ہندی)

ہدیۂ تبریک

از عمدۃ المتکلمین لسان الواعظین عالیجناب مولانا مرزا ابو یوسف حسین صاحب قبلہ لکھنوی

مجھے رسالہ پارۂ دل مصنفہ عالی جناب مولانا سید محمد انور صاحب قبلہ صدر الافاضل مبلغ اسلام کے مطالعہ سے اس قدر مسرت حاصل ہوئی ہے کہ میں آپ کی اس کامیابی پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسئلہ توحید عالم ایجاد کا سب سے پہلا اور اہم مسئلہ ہے جو ہمیشہ مذاہب عالم کا آماجگاہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اسی صحرا میں بڑے بڑے قافلے گم ہو جاتے اور لاکھوں بیڑے غرق ہوتے رہے ہیں۔

یہ بہت مشکل تھا کہ اردو زبان میں ایک بحر زخار کو اس طرح سمو دیا جائے کہ مفاہیم بھی ادا ہو جائیں اور اختصار کا اصول بھی نہ ٹوٹنے پائے اور کوئی جز تشنۂ تحقیق بھی نہ رہ جائے۔ مگر آپ کی طبع وقار اور فکر نقاد نے آخر اس محاذ کو سر کر ہی لیا اور قدیم اور جدید فلاسفہ اور حکماء کے

نظریات کی بہترین طریقوں اور اچھوتی دلیلوں سے تنقید فرمائی جو رسالے کے خصائص سے ہے اس کے بعد توحید اسلام کے رخ زیبا کا بے نقاب ہو کر صاف نظر آجانا اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند عالم طالبان حق کو اس کے ذریعہ صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے اور ہمیشہ اسلام اور توحید اسلام کا بول بالا رہے۔ آمین

حررہٗ

احقر مرزا یوسف حسین عفی عنہٗ

پیش کش

از مؤلف

میرے دماغ میں اوائل عمر سے یہ خیالات گشت کر رہے تھے کہ اصول و فروغ اسلام کے اوپر ایسے جامع اور مستدلل تصنیفات و تالیفات معرض وجود میں لائی جائیں جو ایک طرف تو مختلف فرقہ ہائے اسلام کیلئے قابل قبول ہوں۔ دوسری طرف دیگر مذاہب کو جو اسلام کے متعلق غلط فہمیاں ہیں صحیح معنوں میں دور کر سکیں۔ اپنی تعلیم و تحصیل و دیگر ممالک اسلامیہ و غیر اسلامیہ کے دورہ کے سلسلے میں اسی دہن میں لگاتار کوشش کرتا رہا۔ اگرچہ بیشتر حصہ میرے تصنیفات و تالیفات کا تقسیم ہند کے انقلاب کی نظر ہو گیا۔ لیکن میں نے پاکستان کے وجود کو اس کام کے لئے ایک فال نیک سمجھا اور بیک بینی و دو گوش یہاں یہ سمجھ کر چلا آیا کہ پاکستان میں اس ارادے کی تکمیل کے لئے بیش از بیش سہولیت مہیا ہوں گی۔ اوچ شریف چونکہ ایک تاریخی مرکز علم رہا ہے اس لئے میرا خیال تھا کہ یہاں کی فضا علم پرور ہو گی لہذا دیگر مقامات پر اس جگہ کے قیام کو ترجیح دی کہ گوشہ عافیت میں بیٹھ کر کچھ اہل ذوق کی دلچسپی اور امداد سے تا امکان ملکی اور قومی اور علمی خدمات

انجام دیتا رہوں گا لیکن یہاں کی بے ذوقی اور میری کم مائیگی قدم قدم پر سنگراہ ہوتی رہی۔ آخر کار چار برس اسی تعطل اور جمود میں گزر گئے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا ایک مرد مہاجر علم دوست حبیب الرحمٰن خان صاحب بی اے علیگ بہ سلسلہ ملازمت میونسپل کمیٹی اوچ شریف کے ایڈمنسٹریٹر ہو کر آئے۔ موصوف کی مختلف ملاقاتوں نے میری مردہ بلکہ زندہ درگور حسرتوں کو ایکبار پھر تازہ دم کر دیا۔ آپ ہی کی حوصلہ افزائی اور خدمت کتابت انجام دینے سے یہ کتاب عالم وجود میں آئی جسکی پہلی قسط کا مسودہ برائے نقد و تبصرہ اہل علم و اہل فن کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ ارباب بصیرت فرقہ وارانہ سطح سے بلند ہو کر مجھے اپنے مفید اصلاح اور مشورہ سے سرفراز فرمائینگے۔ تاکہ کتاب دوبارہ اشاعت میں دیگر زبانوں میں بھی طبع ہونے کے قابل ہو سکے۔

خادم اسلام

سید محمد انور محقق مہدی) اوچ شریف

ریاست بہاولپور

۸ رجون ۱۹۵۳ء

مقدمہ

از حبیب الرحمٰن خاں بی اے (علیگ)

جب بسلسلہ ملازمت اوچ شریف آنا ہوا تو میرا خیال تھا اس تاریخی شہر میں جس کو ایک طویل عرصہ تک علوم و فنون کے مرکز ہونے کا فخر حاصل رہا ہو اب بھی ایسے اصحاب علم و فضل موجود ہوں گے جن کے وجود سے علمی روایات زندہ ہوں گی لیکن میری حیرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہاں پہنچ کر میں نے صورت حال کو بالکل برعکس پایا۔ بہرکیف وقت گذرتا رہا اور کچھ عرصہ کے بعد ایک فاضل سید محمد انور صاحب (محقق ہندی) سے سلسلہ ملاقات قائم ہو گیا۔ اس شہر میں ان کا وجود غنیمت نظر آیا اور فرصت کے اوقات میں ان کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا۔ جتنا میں شاہ صاحب سے قریب ہوتا گیا ان کے خیالات مجھ پر زیادہ نمایاں ہوتے گئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ موصوف کافی وسیع النظر علماء میں سے ہیں اور فرقہ وارانہ سطح سے بہت بلند اور مسائل کو صرف حقیقت اور انصاف کی عینک سے دیکھتے ہیں۔

گردوپیش کے حالات تبلا رہے ہیں کہ قوم وحدت ملی کے حقیقی تصور سے ایک غیر محسوس طریقہ پر ہٹتی جا رہی ہے اور یہ صورت حال قومی مفاد کے منافی ہے اس کی روک تھام کے لئے قابل عمل تجاویز کی طرف توجہ

والا ہر محب اسلام کا فرض اولین ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ توحید خالص کے علمبرداروں
میں وحدت ملی کا اصلی خط و خال نظروں سے پوشیدہ ہوتا جا رہا ہے۔
اگرچہ اکابرین ملت اس کو محسوس کرتے ہوئے مناسب تدابیر اختیار کر رہے
ہیں پھر بھی اگر کوئی قابل عمل اور نافع تجویز کسی کے دل و دماغ میں پیدا ہو
تو کم از کم اس کو قوم کے سامنے ضرور آجانا چاہیے۔ شاہ صاحب سے اکثر
ان مسائل پر گفتگو اور تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ اکبار انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا
کہ وحدت ملی کا اصلی تصور توحید خالص سے پیدا ہوتا ہے اور جب کبھی
یہ تصور توحید اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتا تو قوم میں وحدت ملی کا تصور
بھی مسخ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا! اس کا علاج؟ تو فرمایا کہ علاج تو علماء کرام
و مدبرین ملک کرتے چلے آرہے ہیں۔ البتہ میرے ذہن میں بھی ایک خیال ہے
کہ اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ایک بڑی حد تک اختلاف کم ہو کر قوم کو
ایک مرکز پر جمع کرنے کا ایک موثر اقدام ہو سکتا ہے۔ دریافت کرنے پر
فرمایا کہ اکبار پھر توحید کو عقلی روشنی میں اجاگر کیا جائے اور ایک ایسی جامع اور
ہمہ گیر مجموعہ فقہ مصلاء اربع سے مرتب کیا جائے جو اہل سنت والجماعت و
پیروان فقہ جعفری سب کے لئے قابل قبول ہو سکے۔ (یہ رائے ان کی محض خیالی
نہیں ہے بلکہ اس کو ایک حد تک عملی جامہ پہنا چکے ہیں۔ اگر قوم ان کے لئے
سہولتیں مہیا کرے تو مسودہ بہت جلد منظر عام پر لایا جا سکتا ہے)۔
میں نے کہا شاہ صاحب۔ خیال تو بہت اچھا ہے لیکن اس خواب کے

شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں جو دشواریاں ہیں ان کو کس طرح پر عبور کیا جاسکے گا تو فرمایا کہ یہ تو بعد کی باتیں ہیں پہلے تو اس خیال کو قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے اگر قوم نے اس خیال کی تائید کی تو اسباب انشاء اللہ خود بخود مہیا ہو جائیں گے اور صرف یہی خیال اس رسالہ کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی تکمیل بھی ہو گئی جو قوم کے سامنے قسط اول کی شکل میں پیش ہو رہی ہے۔

بحیثیت ایک مبتدی طالب علم کے میرا منصب نہ تھا کہ توحید ایسے دقیق مضمون پر کوئی تنقید یا تبصرہ کروں نہ اس کا کسی طرح پر اہل ہوں لیکن محض اس وجہ سے کہ اس مضمون کی کتابت کی خدمت میں نے انجام دی ہے۔ شاہ صاحب نے مجبور کیا کہ ضرور کچھ لکھوں۔ چنانچہ محض ان کی منشاء کا احترام کرتے ہوئے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگانے پر مجبور ہو کر چند سطریں ضبط تحریر میں لا رہا ہوں۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
غالب

شاہ صاحب نے اس رسالہ کو ایک خط کی شکل میں تصنیف کیا ہے اور بعض مقامات پر جہاں ضرورت محسوس ہوئی اپنی زندگی کے چند واقعات کو ظاہر کیا ہے۔ دوران تصنیف اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ رسالہ کی ضخامت بڑھنے نہ پائے۔ اس وجہ سے طویل اور عریض

مباحث سے گریز کیا ہے۔ اثبات وجود باری اور توحید وغیرہ مسائل پر ضمناً مختلف نظریات کا حوالہ دیا ہے اور صرف اسی حد تک اس پر بحث کی ہے جہاں تک ضروری تھا۔ اگر رسالہ کا یہ اختصار قائم نہ رہتا تو اس میں وہ جاذبیت اور جامعیت پیدا نہ ہوتی جو اس چھوٹی سی تصنیف کا مقصد تھا۔ حتی الامکان اس تصنیف میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ مسائل کی حقیقت عقل اور درانیت کی روشنی میں پیش کی جاوے تاکہ وہ طبقہ بھی مستفید ہو سکے جو ہر مسئلے کو عقل کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہے۔ شاہ صاحب نے ابتدا اثبات وجود باری سے کی ہے اور توحید و نبوت کے متعلق استدلال کر کے آخر میں اپنے اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ ایک ایسی ہمہ گیر وجامع فقہ مصلا و اربع کے مجموعہ سے مرتب کی جائے جو سب کے لئے قابل قبول ہو سکے۔ اپنے محدود مطالعہ کے اندر میں قریب قریب اس خیال پر پختہ ہو گیا تھا کہ فلاسفہ کی اصطلاحات کے اندر رہتے ہوئے ایک قادر مطلق خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ ایک علت العلل کا وجود ثابت ہوتا ہے لیکن اگر علت العلل میں قدرت اور اختیار ثابت نہیں ہو سکتا تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ خدا کا وجود ثابت نہیں ہوا کیونکہ خدا کا تصور بلا ارادہ اور اختیار کے شان خداوندی کے منافی ہے۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ انھیں اصطلاحات فلسفانہ کے اندر رہتے ہوئے فلاسفہ کے غلط نظریوں کو نمایاں کر کے باطل

کیا جائے اور ان خامیوں کو آشکارا کر کے دور کیا جائے۔ جن پر عرصہ دراز سے اصحاب علم و فضل یقین کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہی ایک صورت ہے جو مسئلہ وجود باری کو قریب الفہم بنا سکتی ہے۔

شاہ صاحب نے اس گتھی کو خوب حل کیا ہے انھوں نے اول تو فلاسفہ اور حکماء کے فاعل موجب کے نظریہ کا صحیح طور ابطال کیا ہے اور فاعل مختار کا نظریہ اثبات وجود باری کے ضمن میں بنیادی طور سے پیش کیا ہے۔ علاوہ بریں انھوں نے فلاسفہ کے اس کلیہ کا ابطال کیا ہے کہ قدیم علت کا معلول قدیم اور حادث علت کا معلول حادث اور ثابت کیا ہو کر علت اگر قدیم اور فاعل مختار ہو تو اس کا معلول حادث اور صرف حادث ہو سکتا ہے اور حادث معلول کے لئے بالآخر علت قدیم لازمی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہی ایک واحد طریقہ ہے کہ ان فلسفیانہ اصطلاحات کے اندر رہتے ہوئے بھی ایک قادر مطلق اور فاعل مختار کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ حکماء اور فلاسفہ کے گروہ کو ایک مافوق الفطرت وجود تسلیم کر کے ان کے بنائے ہوئے ہر صحیح اور غلط اصول کو بے چون و چرا تسلیم کر کے اسلام کے نظریہ کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی ایک ناکام کوشش کیجائے۔

اثبات وجود باری کے بیان میں شاہ صاحب نے ایک ایسا جامع اور معنے خیز جملہ لکھ دیا ہے کہ میرے خیال میں اسی ایک جملہ سے

حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے (کہ دنیا میں وجود ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو اپنے کمال ظہور کی وجہ سے ناقابل تعریف ہے) اس موقع پر اکبر الہ آبادی کا ایک مصرعہ لکھدینا نامناسب نہ ہوگا۔ ع

جب سمجھ میں آگیا تو وہ خدا کیونکر ہوا

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ حقیقت کچھ واردات قلبیہ کے ذریعہ ہی سمجھی جا سکتی ہے ایک جگہ شاہ صاحب نے شیکسپیر کے نظریہ توحید کا ذکر کر کے بطلان تثلیث لطریق خطابت تحریر فرمایا ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ محض کسی فرد واحد کے قول کو کسی مسئلہ کے ثبوت میں شاہ صاحب نے بطور حجت کیسے پیش کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک الزامی جواب ہے جس کو مستقل دلیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی لئے غالباً شاہ صاحب نے اسی مقام پر خطابت کی لفظ بڑھا دی ہے۔

اسلامی توحید کے بلند تصور کے ساتھ وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے الفاظ جب میں سنا کرتا تھا تو تعجب میں پڑ جاتا تھا کہ خدا ایک بھی ہے اور ہر چیز خدا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بددیانتی ہوگی اگر میں اس بات کو چھپاؤں کہ میں اپنے گوشۂ دل کی اندرونی تہہ میں یہ چور پاتا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنے والے بمقابلہ اسلام کفر سے زیادہ قریب ہیں لیکن جب بڑے بڑے صوفیائے کرام کی جانب یہ قول منسوب پاتا جن کی بزرگی اور عظمت مسلم الثبوت ہے تو میں ایک حیرت میں پڑ کر اپنی کم علمی کی وجہ

سے خاموش ہو جاتا تھا۔ لیکن دل کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ شاہ صاحب سے بھی جب یہ ذکر آیا تو موصوف کو خود بھی اس مسئلہ میں متردد پایا۔ اس حالت میں ایک طویل مدت گذر گئی۔ دو ایک علماء اور صوفیوں سے اپنے خطرے کا دبی زبان میں اظہار کیا تو انھوں نے بدعقیدگی کا ملزم ٹھہرایا۔ اس کے بعد کسی سے دریافت کرنے کی جرأت اس لئے نہ پڑی کہ خدانخواستہ کہیں کوئی صاحب جلال کفر کا فتویٰ نہ دیدیں۔ لیکن جستجو کرنے والے کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب اس مسئلہ پر اس رسالہ کی کتابت کے دوران میں شاہ صاحب نے بحث کی تو پہلی بار میری یہ خلش دور ہو کر اطمینان حاصل ہوا۔ اس مسئلہ کے متعلق شاہ صاحب نے جو نظریہ پیش کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اور نہ عقلی اور مذہبی حیثیت سے اس پر کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

توحید پر بحث کرنے کے بعد شاہ صاحب نے نبوت عامہ پر خامہ فرسائی کی ہے اس سلسلے میں جس طرح پر انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ منصب نبوت کا حقدار انسان اور صرف انسان ہو سکتا ہے۔ ملائکہ اور عقول مجردہ یا انسان سے پست درجے کی مادیت کی مخلوق نہیں ہو سکتی وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے اس کی مزید توضیح کے سلسلے میں جو مثال پیش کی ہے وہ مسئلہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے۔ نبی کی شناخت اور معجزات کے اثبات میں جو دلائل شاہ صاحب نے پیش کئے ہیں ان سے ہر ذہن رسا

اطمینان حاصل کر سکتا ہے کیونکہ ایک ایسی اعتدالی صورت شاہ صاحب نے سامنے رکھدی ہے جس سے کوئی خلش باقی نہیں رہتی۔ مسئلہ ختم نبوت پر جو معقول دلائل شاہ صاحب نے پیش کیے ہیں ان میں سے بعض تو انوکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو اس خمسہ پر بٹے ہوئے ہیں چونکہ آپ کی ذات پر نبوت کا سد باب کرنا منظور تھا اس لئے آپ کے معجزات کے اثبات میں قدرت کا غیر معمولی اہتمام کرنا ایک یقینی امر تھا اور یہ ایک ایسا اہتمام ہے جو انبیاء ماسبق کے معجزات کے مجموعہ میں بھی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اعجاز قرآن کے بیان میں ظاہر کیا ہے کہ یہ معجزہ آپ کا ایسا جاری اور ساری معجزہ ہے کہ قیامت تک آپ کی نبوت کی تصدیق اور دوسرے نبی کی نبوت کا انکار کرتا رہے گا۔ آخر میں شاہ صاحب نے ایک جامع اور ہمہ گیر فتنہ کی طرف قوم کو متوجہ کیا ہے یہ خیال اسمیں شک نہیں کہ نہایت ہی مستحسن خیال ہے اور اگر وسیع النظری کیساتھ فرق اسلامی اس کو شرف قبولیت بخشیں اور یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے تو گو یہ خیال گوناگوں مشکلات سے خالی نہیں ہے پھر بھی اسلامی فرقہ پرستی کو کم کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوگا اور اختلافات کا خلیج ایک حد تک پٹ جائیگا۔

حبیب الرحمن خاں مہاجر

اڈمنسٹریٹر۔ اوچ شریف

۸ر جون ۱۹۵۳ء

میں کون ہوں۔ کہاں سے اور کیوں آیا۔ کہاں جاؤں گا

؟

تمہید

پارۂ دل میاں دلارے سلمہ'

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب سے انسانیت میں سوجھ بوجھ اور بشریت میں غور و فکر کا مادہ ترقی کرنے لگا۔ آدمیت اپنی طفلانہ ترقی کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ پر غور کرتی رہی کہ میں کون ہوں؟ لیکن آج تک یہ گتھی فلسفہ کے ہاتھوں سلجھ نہ سکی اور اب بھی یہ مسئلہ تشنۂ تکمیل ہے۔ ہر شخص کو یہ فطری حق حاصل ہے کہ عالم وجود میں آنے کے بعد جب بھی وہ اپنے دلی اظہار پر قادر ہو تو یہ سوچے کہ میں کون ہوں؟ ایک سلیم العقل بچے کے ذہن سے یہ سوال پیدا ہونا اس کے فطری تقاضہ کا پتہ دیتا ہے۔

عزیز از جان! تمہارا یہ سوال میری نظر میں بہت قابل قدر ہے آؤ تمہارے ذہن میں روشنی پیدا کرنے کے لئے تمہارے سامنے اس مسئلہ کے متعلق سلف صالحین کی تگ و دو کا تھوڑا سا ایک نمونہ پیش کردوں۔ بعد میں

اپنے فیصلہ کی رائے بھی ظاہر کروں گا۔ تمہاری دماغی صلاحیت سے پتہ چلتا ہے کہ تم اس کم سنی میں ایسے گہرے اور عمیق مسائل کی کرید اور جستجو میں دلچسپی لیتے ہو۔ لہذا سنو! ۴۲ء میں میں سفالا پوش خام مکان کی تیاری کے سلسلے میں ایک کمہار کے پاس گیا اور کھپریل کی تیاری کا آڈر دیا۔ اس غریب نے ہزاروں کھپریل تیار کر کے دھوپ میں خشک ہونے کو ڈالدیئے اتفاق سے بارش ہوئی اور وہ سب گھل کر مٹی ہو گئے۔ دوسرے دن جو میں اس کے پاس گیا تو دیکھا کہ گلی ہوئی مٹی کو گوندھ کر وہ دوبارہ اپنے چاک پر کھپریل تیار کر رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولا! مولوی صاحب ہم ہندو مذہب رکھتے ہیں اور ہمیشہ اسی سوچ میں رہتے ہیں کہ ہم کون ہیں مگر ہمارے گرو جی مہاراج یہ تشفی دیکر ٹالدیتے ہیں کہ میاں ہماری تمہاری حالت تو چاک کی مٹی کی ایسی ہے۔ جیسے مٹی سے تم مختلف شکلیں بنا اور بگاڑ سکتے ہو مگر اس کے مادہ کو فنا نہیں کر سکتے اسی طرح سے اللہ میاں تو ایک کمہار ہیں جو مادہ میں مختلف شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ نہ ہم کہیں سے آئے ہیں نہ کہیں جائیں گے۔ یہی مادہ ہماری اصلیت ہے جو قدیم ہے

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا کو انسان نے پیدا کیا ہے خدا خود کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ انسان کو اپنی تگ و دو اور کوشش میں جہاں مایوسی

حاصل ہوتی ہے اور باوجود انتھک کوششوں کے کسی کام پر قادر نہیں ہوتا وہاں اس کی مایوسی پکار اٹھتی ہے کہ ہم سے بالاتر کوئی طاقت ہے جو یہ کام نہیں ہونے دیتی۔ اسی کا نام انسان نے اپنی اصطلاح میں خدا رکھ لیا ہے۔ لہذا پتہ یہ چلتا ہے کہ انسان کو خدا نے نہیں پیدا کیا بلکہ خدا کو انسان نے پیدا کیا ہے۔ مذاہب عالم میں سب سے بڑی اور فطری دلیل جو وجود باری تعالیٰ پر قائم کی جاتی ہیں اس کا خلاصہ اور نچوڑ یہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے مجھے اگر آپ مجرم قرار دیں تو یہ حق ہو چکا ہے کہ میں بجا طور پر کہوں کہ خدا کو انسان نے پیدا کیا ہے اور انسان مع اپنے قدیم مادہ کے قدیم ہے۔

وجود باری پر مختلف نظرئیے

واہ بھئی کمہار۔ گرو گرڑ ہی رہے چیلے شکر ہو گئے۔ تمہارے گرو جی مہاراج تو کمہار کے روپ میں خدا کو مانتے ہیں۔ تم نے تو سرے ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن بات پتے کی کہی ہے۔ خیر جواب تو جب ہوگا تو ہوگا میں تمہیں بتلانا چاہتا ہوں کہ تم ہی اس منے کے خمار میں سرشار نہیں بلکہ تم سے اگلے بھی اسی خبط میں مبتلا تھے اور لطف یہ ہے کہ وہ لوگ جو عقل کے ذہنی اور فہم و فراست کے علمبردار فلسفی کہلاتے ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ بے شعور اور اک چھوٹے چھوٹے ذروں سے عالم کی اشیاء خود بخود بنتی اور بگڑتی

رہتی ہیں نہ ان کا کوئی خالق ہے نہ وہ فنا ہوتے ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہینگے۔

بعضے حکما جو خدا کے وجود کے قائل بھی ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا حکیم تو ہے لیکن فاعل موجب ہے۔ جسطرح آگ سے اس کے اثر حرارت کا صدور ضروری ہے۔ اسی طرح خدا سے اثر مخلوق کا صدور بھی ضروری ہے لیکن چونکہ وہ واحد دیکھتا ہے اور جہات مختلفہ اس میں نہیں موجود ہیں اس لئے اس سے ایک ہی معلول صادر ہو سکتا ہے کیونکہ الواحد لا یصدر منہ الا الواحد۔ ان کا مسلمہ کلیہ ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ خدا نے صرف عقل اول کو پیدا کیا ہے اور عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول۔ اور عقل ثانی نے عقل ثالث اور فلک دوم اور عقل ثالث نے عقل رابع و فلک سوم یہاں تک کہ عقل نہم نے عقل دہم اور فلک نہم کو پیدا۔ اور عقل دہم میں کیونکہ جہات مختلفہ موجود ہیں اس لئے اس نے سارے عالم کو پیدا کیا۔ یہ ہے حکما متقدین کے نظریات کا خلاصہ۔ ان عقل کے دہنی لوگوں سے کون پوچھے کہ جہات مختلفہ جو عقل دہم میں تجویز کئے جاتے ہیں وہ کیا ہیں جو دوسرے ماتحت عقول میں موجود نہیں ہیں اور صرف عقل دہم ہی میں موجود ہیں۔ اس سے بھی قدیم عالم ہی ثابت ہوتا ہے مگر فیثا غورث کہتا ہے کہ آسمان وغیرہ کچھ نہیں سب حد نظر ہے۔ مرکز عالم صرف آفتاب ہے اور اسی سے مختلف اوقات میں مختلف اجزا علیحدہ ہوتے رہتے جو سیاروں کی شکل میں نمودار ہوئے اور اپنی باہمی کشش کیوجہ سے

فضاء لا متناہی میں مقیم نظر آتے ہیں۔ زمین بھی اس کی رائے میں آفتاب کا ایک علیحدہ شدہ جزء ساکن ہے جو مدت ہائے مدید تک آگ کا گولا بنی رہی اور اپنے ابخرات اور ہوا کے سرد جھونکوں سے پیچکر ٹھنڈی ہوتی رہی۔ یوں ہی پانی پیدا ہوا۔ اور تری سے مختلف قسم کے نباتات مختلف اثرات کے ماتحت پیدا ہوئے اور پھر اس میں جاندار اشیاء عالم وجود میں آئیں۔ انسان انہیں جاندار اشیاء کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنف ہے۔

ڈارون صاحب نے اسی تدریجی ترقی کے سلسلے میں آدمی کا مورث اعلیٰ بندر قرار دیا ہے۔ گویا ان کی نظر میں انسان ایک دم کٹا بندر ہے۔ اس جگہ پر اکبر الہ آبادی کا ایک شعر مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔ ؎

ڈارون صاحب حقیقت سے بہت ہی دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

اثبات وجود باری تعالےٰ

عزیز از جان۔ یہ افکار و خیالات گو تمہارے ضیافت طبع کیلئے پیش کئے گئے ہیں مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارے ذہن میں ان خیالات کے تضاد اور تباین سے کوئی الجھن اور تشویش نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے خدا کا صحیح تخیل حقائق و معارف کی روشنی میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے خود بخود غلط نظریے باطل ہو جائینگے اور تم کو ان کی خامیوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

دنیا میں موجود ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو اپنے کمال ظہور کیوجہ

ناقابل تعریف ہے۔ اسی وجہ سے محققین اور فلاسفہ اس کی تعریف میں ناکام رہے۔ ترشی کی تعریف۔ شیرینی کی توصیف۔ روشنی اور تاریکی کی جامع اور مانع حد قائم کرنے سے اگر عقل عاجز ہے تو وہ صرف اسی وجہ سے کہ ان کا وجود کمال وضاحت میں ہے۔ ترشی اور شیرینی اگر سمجھائی جاسکتی ہے تو وہ تعریف اور استدلال سے نہیں بلکہ صرف تمثیل اور تشبیہ سے مثلاً شیرینی جیسے قند، شکر وغیرہ۔ ترشی جیسے املی۔ لیموں وغیرہ۔ اسی طرح سے وجود باری اپنے کمال ظہور کی وجہ سے ناقابل تعریف ہے اور فلاسفہ اپنی تعریف اور استدلال سے بجائے وجود باری ثابت کرنے کے اس کو اور الجھاتے چلے آئے۔ عقل کی دوڑ دھوپ، فکر و تدبیر کی جولانی اس حقیقت بدیہیہ کو ثابت نہیں کرسکتی۔ ہاں جہاں پر عقل کی بلند پروازی، فہم و ادراک کی چھان بین سپر انداختہ ہوجاتی ہے اور ہوش و حواس عاجز آجاتے ہیں وہاں صرف تمثیل اور تشبیہ ہی اس وجود باری کو کچھ قریب فہم کرسکتی ہے۔ اسی وجہ سے نباض فطرت انسانی اور حقائق شناس مذہب اسلام نے وجود باری کو واردات قلبیہ کے ذریعہ سے سمجھانا چاہا ہے۔

نپولین کا نظریہ

انسان اپنی عقل و دانش مندی کی بے پناہ قوت کی وجہ سے عالم کی بڑی بڑی طاقتوں پر قابو حاصل کرلیتا ہے اور اس کامیابی کے گھمنڈ میں وہ اتنا مست ہوجاتا ہے کہ آخر کسی چیز کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ نپولین ممالک کو فتح

کرتے کرتے اس نتیجہ تک پہونچ گیا تھا کہ دنیا کی کسی چیز کو اپنی طاقت سے باہر نہیں سمجھتا تھا لیکن جب وہ واٹرلو میں شکست کھا کر سینٹ ہیلنا میں برٹش کمانڈر انچیف کے ہاتھوں قید ہوا۔ تو اس کی اسیرانہ زندگی کی مجبوریاں شاہد حال تھیں کہ اب وہ فاتحانہ نشہ ہرن ہو چکا ہے۔ مزید براں نپولین کے تبصرے اپنی ناکامی پر اس مفہوم میں کہ میری تھکی ہوئی فوج۔ سردی کی شدت۔ رسد رسانی کی دقت۔ سب سے بالاتر فطرت کا برقت عدم تعاون میری ناکامی کا سبب ہوا۔ جس سے اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری طاقت سے بھی بالاتر کوئی طاقت موجود ہے جس نے مجھے کامیاب نہیں ہونے دیا (اسی طاقت کو مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں)۔ کیا یہ درست ہے کہ برٹش کمانڈر انچیف نے نپولین کے ذہن میں خدا پیدا کیا۔ اگر کوئی سلیم الطبع اس کو صحیح مانتا ہے تو اسے خدا سے زیادہ بلند مرتبہ برٹش کمانڈر انچیف کو دینا چاہیے اور اگر یہ درست نہیں اور یقیناً درست نہیں۔ تو کہنا پڑے گا کہ انسان کی مجبوریاں خدا کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ اپنی عاجزی اس وجود حقیقی کی ملتفت کرتی ہے۔ انسان کی کسی وقت کی ناکامی کی وجہ سے کسی ہستی کا علم ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس فرد واحد کو اس وقت اس مجبوری کی وجہ سے اس ہستی کا علم ہوا۔ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے والے اور زندگی کو ایک ہی پہلو پر گذارنے والے کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتے۔

شیکسپیر کا نظریہ

اسی لئے کامیابیوں کے روز روشن اور ناکامیوں کے بھیانک تاریک چہرے دکھا کر شیکسپیر ایسا محاکات فطرت کرنے والا ڈرامہ نویس اپنے ایک ڈرامے میں لکھتا ہے کہ ہماری کامیابی اور ناکامیابی کا راز ایک ایسی بالاتر طاقت کے ہاتھ میں ہے جو ہمیں قادر اور عاجز بناتی رہتی ہے۔ شیکسپیر کی شخصیت کے متعلق مجھے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یورپ اپنا سب کچھ کھو کر بھی اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یورپ زدہ مائل بہ دھریت ذہنیت کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کہ وہ شیکسپیر کے اس نظریہ پر غور کرے اور سوچے کہ اس نے اس فطری وجود کو کس کس طرح سے اجاگر کیا ہے۔

بطلان تثلیث بطریق خطابت

یہاں پر ایک اور دعوت فکر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر شیکسپیر یورپ کی نظر میں خدائے سخن ہے تو وہ بار بار یہی کہتا ہے کہ ایک اور صرف ایک ہی وہ بالاتر طاقت ہے جس کے ہاتھ میں ہماری کامیابی اور ناکامیابی کا راز ہے نہ کہ تین۔ اس سے توحید فی التثلیث کا نظریہ بھی باطل ہوتا ہے۔ ایک تین اور تین ایک۔ یہ ایک ایسا بھونڈا، بھدا اور نامعقول نظریہ ہے جس کو فطرت کسی طرح سے برداشت نہیں کر سکتی۔

توحید عالم پر ایک سرسری نظر

بیٹے تمہیں ہنسی آتی ہے اور اپنے طفلانہ بھولے پن سے حیرت زدہ

ہو کر کہتے ہو کہ ایک تین اور تین ایک کیونکر ہو سکتا ہے مگر یہ ان ترقی یافتہ یورپ کا نظریہ ہے جو میدان تحقیق میں اپنے آپ کو سارے عالم کا علمبردار بتلاتے ہیں مگر حقائق اور معارف سے نابلد ہونے کی وجہ سے خالی اعداد و شمار سے بھی مقام الوہیت میں لغزش کھا جاتے ہیں۔ بر ایں عقل و دانش بباید گریست۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ فلاسفہ ہیں جو بزعم خود روحانیت کے دھنی اور الوہیت کے ماہر اپنے کو جتاتے ہیں مگر علت و معلول کے دلدل میں پھنس کر ایسے بے دست و پا ہو رہے ہیں کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مصداق صادق آرہا ہے۔ تعجب اور انتہائی تعجب ہے کہ علماء ظاہر اور متکلمین اسلام بھی فلاسفہ کے دلائل اور پھر اس سے مرعوب ہو کر ان کے نظریہ کو توحید حقیقی میں کھینچ تان کر لانے کی ناکام کوشش کرتے چلے آئے اور میری تشویش اور الجھن کی انتہا ہو گئی جب میں نے علماء باطن اور صوفیاء کرام کی حقیقت شناس نظروں کو بھی اس منزل پر الجھا ہوا پایا۔ کیونکہ میں خود بھی ایک صوفی منش فقیر ہوں جو ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور دیگر بلاد امصار کے دورے کے سلسلے میں علماء ظاہر اور باطن سے فیض یاب ہوتا رہا۔ مصر کے سرسبز وادی اور افریقہ کے بے آب و گیاہ جنگل بھی میری تگ و دو سے خالی نہ رہے۔ جہاں جہاں اہل کمال و فضل کی خبر ملی اس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ آخر رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کی وجہ سے

اہل باطن کی ریاضت نفس کشی ان سے قریب تر کرتی گئی کیونکہ ان کے قول اور فعل میں کسی طرح کی دورنگی نہیں پاتا تھا۔ آخر کار مائل بہ تصوف ہونے لگا مگر وحدت وجود میرے خیالات میں قدم قدم پر سنگ راہ ہوتا رہا۔ کسی بزرگ سے میری پیاس نہ بجھ سکی۔ ایک دن حلقہ احباب میں بیٹھا ہوا اس مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا۔ رات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ آپ کا ارشاد ہوا کہ وحدت وجود وار دات قلبیہ کی پہلی منزل ہے اس کے علاوہ اور چار منزلیں ہیں۔ تم اس پر غور کرو۔ ریاضت اور مجاہدہ کو بڑھاؤ۔ انشاء اللہ حقیقت عیاں ہو جائے گی۔ خواب سے بیداری کے بعد کچھ سکون قلب حاصل ہوا اور بموجب ارشاد غور و فکر اور ریاضت سے وحدت وجود کے متعلق جس نظریہ تک پہنچا ہوں اس کو آگے چلکر اپنے بیان میں ظاہر کروں گا۔ قبل اس کی وضاحت کے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ متکلمین کا ایک گروہ جس کو اشاعرہ کہتے ہیں خدا کو قدیم اور عالم کو حادث اور خدا کا پیدا کردہ مانتے ہیں۔ اور کسی علت اور معلول کے سلسلے اور قانون قدرت کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس معتزلہ عالم میں اسباب وعلل کے قائل ہیں اور کبھی کبھی خرق عادت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ فلاسفہ سلسلہ علل اور معلول کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی بھی خرق عادت کے قائل نہیں، اور خدا کو قدیم مانتے ہوئے عالم کی علت قرار دیتے ہیں مگر ان کے نظریہ کی بنا پر علت سے اس کا اثر اور معلول جدا نہیں ہو سکتا اس بنا پر عالم کو بھی

قدیم مانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ علت کے لئے محض تقدم ذاتی کافی ہے تقدم زمانی ضروری نہیں۔ اس پر یہ فطری اعتراض انھیں کے مسلمات کی بنا پر عائد ہوتا ہے کہ جب خدا اور عالم دونوں قدیم ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول قرار دینا ترجیح بلا مرجح ہے۔ نیز خدا اور عالم جب دو قدیم ہوئے تو ان میں دوئیت کی تفریق مستلزم ہے کہ دونوں ما بہ الاشتراک اور ما بہ الامتیاز سے مرکب ہوں اور جب دونوں مرکب ہوئے تو اپنی ہیئت ترکیبی میں اجزار کے محتاج ہوئے اور چونکہ مرکب سے اجزار کا وجود مقدم ہوتا ہے لہٰذا ایک طرف تو مقدم جاتا رہا دوسری طرف احتیاج کی وجہ سے واجب الوجود اور قدیم نہ رہے بلکہ ممکن ہو گئے۔

اشاعرہ نے اس اٹل اور لاجواب اعتراض سے بچنے کیلئے سلسلۂ علل و معلول کو نہ تسلیم کرتے ہوئے خدا کے قدم کے ساتھ یہ تاویل کی ہے کہ حدوث عالم کی۔ خدا یوں علت ہے کہ اس کا ارادہ یا تعلق ارادہ یہ خود حادث ہے اور یہی ایجاد عالم کا باعث ہے اس توجیہ سے بزعم خود اشاعرہ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی علت تامہ ہونے میں کوئی نقص لازم نہیں آتا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ ارادہ یا تعلق ارادہ۔ یہ خود حادث ہے یا قدیم۔ اگر قدیم ہے تو تعدد قدما لازم آتا ہے جس کا بطلان اوپر ذکر ہو چکا ہے اور اگر حادث ہے تو اس کے لئے کسی دوسری علت کا ہونا ضروری ہے اگر وہ بھی حادث ہے تو اس کے لئے بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ غیر انتناہی

جاتا ہے جو محال ہے۔ میرے خیال میں فلاسفہ کی طرف سے تو اعتذار کیا جاسکتا ہے کہ وہ عالم کو قدیم مانتے ہوئے خدا کو اس کی علت تامہ قرار دیتے ہیں اور علت کے لئے تقدم ذاتی کافی سمجھتے ہیں لیکن ان مذہبی ذمہ داروں کو کیا کہوں جنھوں نے فلسفہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمونے کی ناکام کوشش کر کے اور بھی مسئلہ کو ملیامیٹ کر دیا۔ صوفیا کرام حضرات نے یہ دیکھا کہ وجود باری اور کائنات دو الگ الگ چیزیں ماننے سے یہ دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لہذا یہ تسلیم کر لیا کہ کائنات وجود باری سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہی ہستی مطلق اور وجود مطلق تعنیات اور تشخصات کے بھیس میں آکر ممکنات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے یعنی عالم کی ہر شے خدا ہے اسی کو ان کی اصطلاح میں ہمہ اوست یا وحدت الوجود کہتے ہیں لیکن اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہستی مطلق اور وجود مطلق اور تعنیات اور تشخصیات میں کون سی نسبت ہے۔ خیر المتصوفین مولانا روم علیہ الرحمہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک نامعلوم نسبت ہے جیسے روح کا تعلق جسم سے ہے۔ جس کا شاہد مولانا کی مثنوی کا شعر ہے۔ ع

اتصالی بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

میں یہ کہتا ہوں کہ اس نسبت کو کوئی نام دیا جاسکے یا نہ دیا جاسکے عقلی حیثیت سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ نسبت جو اس

وجود مطلق میں تعینات اور تشخصات پیدا کر کے ممکنات کے افراد حادث کرتی ہے وہ خود حادث ہے یا قدیم۔ اگر قدیم ہے تو تعدد قدما لازم آتا ہے اور اگر حادث ہے تو یہ سلسلہ الی غیر النہایت چلا جاتا ہے اور یہ دونوں محال عقلی ہیں جس کا تفصیل سے بیان اوپر ہو چکا۔ لہٰذا تمام مباحث کی بنا پر توحید کی گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی اور ایک مفکر الہیات کی تشویش ذہنی ان پیچ در پیچ راہوں کی وجہ سے الجھتی چلی جاتی ہے۔

سنور سکتی نہیں زلف دراز الجھن یہ الجھن ہے
میرے دل پر اسیری میں نہ کچھ الزام آجائے

مقدمات توحید

بیٹے تم نے یہ افکار پارینہ اور خیالات دیرینہ تو بہت ہنس ہنس کے سنے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ لیکن تم کو یہ واضح ہونا چاہیے کہ علوم و معارف کا ادراک اور حقائق کا انکشاف کسی کا حصہ نہیں ہے۔ جو راہ طلب میں سرگرداں اور پریشان ہو اور اسی دھن کا دیوانہ ہو اسے مبدء فیاض سے کچھ مل ہی جاتا ہے۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ضرور ہے لیکن آج اس چیز پر قلم اٹھا رہا ہوں جس پر اگلوں کی کاوش فکر ناکام رہی اور قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔

وما توفیقی الا باللہ

قبل اس کے کہ اس جواب کی وضاحت کی جائے چند مقدمات کی

وضاحت ضروری ہے۔

(۱) فاعل موجب (۲) فاعل مختار (۳) علت تامہ

(۴) علت ناقصہ (۵) فاعل قدیم کا معلول قدیم۔ (۶) فاعل

حادث کا معلول حادث۔

اول فاعل موجب اس کو کہتے ہیں جس سے اس کا اثر اور معلول جدا نہ ہو۔ جیسے آگ سے اس کی حرارت۔ چونکہ فاعل موجب میں اس کا اثر یا معلول اس کی اجزاء ذات یا لوازمہ ذات میں توام یعنے چسپاں ہوتا ہے لہذا فاعل موجب اگر قدیم ہو گا تو اس کا اثر اور معلول بھی قدیم ہو گا۔

دوئم فاعل مختار اس کو کہتے ہیں جو اپنے قصد اور ارادہ سے کوئی معلول صادر کرے۔ فاعل مختار کا معلول اس کے اجزاء ذات یا لوازمہ ذات میں شامل نہیں ہوتا۔ جو اس سے منفک نہ ہو سکے۔ بلکہ ایک علیحدہ چیز ہوتی ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ فاعل مختار قدیم بھی ہو اور اس کا معلول اور اثر جس وقت وہ اپنے قصد اور ارادے سے صادر کرے حادث ہو جیسے انسان اپنے ہاتھ کی حرکت کی بذات خود تنہا علت تامہ ہے۔ اگر ہاتھ کو حرکت دے تو اس کا معلول حرکت ید صادر ہو گی ورنہ نہیں۔ انسان اگر زندگی بھر اپنے ہاتھ کو حرکت نہ دے تو معلول فوراً بغیر احتیاج غیرے صادر ہو کر فنا ہو جائے گا جس سے حدوث خود ہی ظاہر ہوتا ہے۔ کائنات عالم کے فرد فرد کا جائزہ لیتے ہوئے زندگی کے ہر شعبہ میں اور ترقی معلومات

کی ہر راہ میں یہ حقیقت بالکل بدیہی ہے۔ جن آنکھوں سے یہ پردہ نہیں اٹھا وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ کر صحیفہ قدرت اور عناصر فطرت پر گہرا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے۔ جیسے آگ سے حرارت۔ پانی سے برودت۔ ہوا سے رطوبت۔ مقناطیس سے کشش اور دیگر اشیاء عالم کے خواص ان سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سے یہ سلسلہ علل اور معلول خدا تک پہنچتا ہے لیکن انھوں نے اس باریک چیز پر نظر نہ کی کہ خواص اشیاء کے ساتھ حضرت انسان بھی موجود ہیں جو اپنے افعال اختیاریہ کی علت تامہ ہیں ان پر وہ سلسلہ علل و معلومات چسپاں نہیں ہوتا۔ بلکہ حیوانات بھی اپنے افعال ارادیہ میں خود مختار ہیں جب چاہتے ہیں اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے ہیں۔ ان کا معلول بھی اکل و شرب نقل و حرکت ان کے تابع ہے جب موجودات عالم میں دو طریقے صدور معلومات کے نظر آتے ہیں ایک فاعل موجب دوسرے فاعل مختار تو یہ انتہائی تنگ نظری اور کوتاہ بینی ہے کہ خدا کو فاعل موجب قرار دے کر علل اور معلول کی جکڑ بندیوں میں محبوس اور مقید کیا جائے۔ وائے بر حال ما کہ ہم اپنے کو بلکہ حیوانات کو بھی اپنے افعال ارادیہ کی علت تامہ قرار دے کر ان کے اثر معلول کو تو حادث قرار دیں اور خدا کو معاذ اللہ حیوانات سے کم تر قرار دیکر اسکے معلول کو اس کی ذات یا لوازمہ ذات سے وابستہ سمجھتے ہوئے قدیم قرار دیں۔

سوئم۔ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جو تنہا بذات خود بلا احتیاج غیر اپنے

معلول کو وجود میں لا سکے۔ جیسے آگ سے حرارت۔ انسان سے اس کے ہاتھ کی حرکت اختیاری۔ مگر فاعل مختار میں علت تامہ کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کے معلول کا وجود فوراً ضروری نہیں۔

چہارم۔ علت ناقصہ یا علت غیر تامہ۔ علت غیر تامہ اس کو کہتے ہیں۔ جو بذات خود تنہا بدر احتیاج غیرے اپنے معلول کو وجود میں نہ لا سکے۔ اس کی چار[۴] قسمیں ہیں:۔ علت[۱] مادی۔ علت[۲] صوری۔ علت[۳] فاعلی۔ علت[۴] تمائی۔ جیسے میز، کرسی۔ اس کی علت مادی لکڑی ہے لیکن صرف لکڑی کے وجود سے میز، کرسی عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ سب سے پہلے میز کرسی کی غرض و غائیت استعمال ذہن میں آتی ہے یہ ہے علت تمائی۔ اس کے بعد ذہن میں میز اور کرسی کا ایک نقشہ اور صورت بنتا ہے یہ ہے علت صوری اب عالم خارج میں لانے کے لئے کسی مادہ کی تلاش ہوتی ہے، یہ ہے علت مادی۔ جیسے لکڑی۔ جب لکڑی بھی مہیا ہو گئی تو کسی بنانے والے کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ ہے علت فاعلی۔ جب یہ تمام منازل طے ہو جاتے ہیں تب کرسی اور میز عالم وجود میں آتے ہیں۔ اور اس کے بنانے کی غرض جلوہ اور نشست وغیرہ۔ علت تمائی پوری ہوتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ علت تمائی عالم عقل میں سب سے پہلے آتی ہے اور عالم کائنات میں سب کے بعد یعنی آخر میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔

پنجم۔ فاعل قدیم کا معلوم قدیم۔ یہ کلیہ فلاسفہ کا فاعل موجب میں تو

کسی حد تک درست ہو سکتا ہے کیونکہ فاعل موجب میں اس کا اثر اور معلول کوئی علیحدہ چیز نہیں ہوتی بلکہ فاعل موجب کے اجزار ذاتیہ یا لوازمات ذات میں شامل ہیں اس لئے کسی طرح کی دوئیت کا وجود نہوئے تعدد قدما کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس مقام پر میں یہ کہتا ہوں کہ فاعل موجب اور اس کے اثر کو علت و معلول موثر اور اثر کا لقب دینا ہی درست نہیں کیونکہ علت و معلول کا مفہوم بداہتہً دوئیت کی شہادت دیتا ہے اور فاعل موجب اور اس کے اثر میں کسی طرح کی دوہیئت کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے وجود میں ممکن نہیں۔ لہٰذا فاعل موجب میں علت و معلول موثر اور اثر کے الفاظ کا استعمال ہی درست نہیں ان الفاظ کا صحیح محل استعمال فاعل مختار ہی میں موزوں معلوم ہوتا ہے اور فاعل مختار میں اگر وہ قدیم ہو تو اس کے معلول کا قدیم ہونا بالکل غلط اور سراسر باطل ہے کیونکہ فاعل مختار میں اس کا اثر فاعل سے علیحدہ چیز ہوتا ہے جس کو دوئیت مستلزم ہے لہٰذا تعدد قدما لازم آئے گا جس کا بطلان اوپر ذکر ہو چکا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ علت اگر قدیم اور فاعل مختار ہو تو اس کا اثر اور معلول حادث اور صرف حادث ہی ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔

ششم فاعل حادث کا معلول حادث۔ یہ کلیہ سلسلہ ممکنات میں تو درست اور صحیح ہے کیونکہ ایک حادث دوسرے کی اور دوسرا تیسرے کی علت ہو سکتا ہے مگر آخیر میں کسی جگہ پر جا کر فاعل حادث کی علت قدیم ہی کو ماننا پڑے گا

ورنہ سلسلہ الی غیر النہانیت چلا جائے گا جو محال ہے۔

دلیل توحید

ان تمام مقدمات کی وضاحت کے بعد یہ حقیقت روز روشن کیطرح واضح ہوگئی کہ فلاسفہ کے مسلمات کی بنار پر خدا کو فاعل موجب قرار دینے سے عقلی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ وحدت وجود کی بنار پر تشخصات وتصنیفات کا مبہم گھروندا انھیں فلاسفہ کے نتائج بد تک منتج ہوتا ہے دیگر علمار اور متکلمین کی نسبت اور تعلق نسبت کا سلسلہ بھی فلاسفہ کے تخیل سے متاثر نظر آتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ خدا کو فاعل مختار تسلیم کیا جائے۔ اس صورت میں خداوند عالم قدیم بھی رہتا ہے اور عالم حادث بھی۔ پھر بھی خداوند عالم کی علت تامہ ہوسکتا ہے کیونکہ فاعل مختار اگر کسی شے کی علت تامہ ہو تو اس کے معلول کا حدوث فوری نہیں ہے اور نہ کوئی محال لازم آتا ہے۔ مجھے تعجب رہے کہ متکلمین اکثر کہیں کہیں اپنے بیان میں خدا کے لئے کسی نہج سے ارادہ تجویز کرتے ہیں پھر بھی فلاسفہ کے علل اور معلول مغالطہ میں مبتلا ہوگئے۔ حالانکہ یہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ جب ایک ضعیف البنیان فانی انسان فاعل مختار ہے اور اپنے افعال کی علت تامہ ہوتے ہوئے جب چاہتا ہے اپنے معلول کو صادر کرتا ہے اور جب نہیں چاہتا نہیں صادر کرتا تو جو انسان کی بھی علت تامہ ہے یعنی خدا اس میں فاعل مختار کا وصف بدرجہ اتم موجود ہونا چاہیئے اور ہے بھی

ایسا ہی۔ یہی وہ جواب ہے جس پر علمار متکلمین دم بخود۔ فلاسفہ انگشت بدنداں اور اہل باطن حیراں ہوں گے کیونکہ عقلی حیثیت سے اگر توحید کچھ سمجھی جاسکتی ہے تو وہ یہی جواب ہے اس پر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا ارادہ باعث ایجاد عالم ہوا تو احداث عالم کی علت تامہ ارادہ ہوا۔ اب وہ ارادہ کیا ہے۔ حادث ہے یا قدیم۔ اشاعرہ تو ارادہ کو قدیم مراد دیکر اپنے مزید الجھن میں ڈال لیں گے۔ لیکن میں تو یہ کہوں گا کہ ارادہ حادث ہے اور حادث کے لئے چونکہ کسی علت قدیم کی ضرورت ہے۔ وہ خداوند کی ذات ہے۔

حقیقت راکہ مستور نظر بود
بما تشہیر خاص و عام کردیم

ہمہ اوست اور توحید کا حقیقی مرقع

رہ گیا وحدت الوجود جس کے متعلق یہ اشارہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ریاضت و فکر سے جس نتیجہ تک پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے مسلک میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جاتے ہیں۔ عشق مجازی کا فانی المحبوب۔ اس کے بعد فنا فی الشیخ یعنی فنا فی المرشد۔ اس کے بعد فنا فی الرسول۔ پھر فنا فی اللہ مع اپنے مدارج خمسہ عشق کی پہلی منزل جس کو فنا فی المحبوب کہتے ہیں۔ اس میں حبیب کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اپنے احساس الم و لذت سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ یہاں پر

کتاب العشق کی یہ حکایت قابل ذکر ہے کہ ایک دیگ میں پانی چڑھا دیا گیا، آگ نیچے روشن کر دی گئی۔ عاشق زار کے ہاتھ میں کفگیر دیدی گئی اور حکم دیا گیا کہ کفگیر کے ذریعے دیگ چلاتے رہو۔ اور محبوب اس کا سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ دیگ کے کھولتے ہوئے پانی کو کفگیر سے چلاتے چلاتے وہ جمال محبوب میں اس قدر محو ہوا کہ کفگیر ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ہاتھ سے کھولتے ہوئے پانی کو چلاتا رہا یہاں تک کہ اس کی ہاتھ کی کھال اُدھڑ گئی اور اسے اس تکلیف کا احساس نہ ہوا۔ اس سے زیادہ منزل اونچی ہوتی ہے تو عاشق زار فراق اور جدائی کی منزل سے بے نیاز ہو کر محبوب میں جذب ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ اونچا ہو گیا تو ہر شئے میں محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے۔ مجنوں کو لیلےٰ کی جدائی بہت شاق گذری تھی۔ لیکن جب عشق کچھ پختہ ہو چلا تو وہ یہ کہا کرتا کہ لیلےٰ میں ہی ہوں۔ جب اور آگے بڑھا تو اپنی دشت پیمائی اور صحرا نوردی میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ خدا کی قسم اے جنگل کی ہرنوں مجھے بتاؤ میری لیلےٰ تم میں سے ہے یا انسان میں سے۔ ؎

تاللہ یا ظبیات القاع قلن لنا   لیلای منکن ام لیلا من البشر

جب عشق مجازی میں عشاق اس منزل تک پہونچ جاتے ہیں کہ ہر چیز پر ان کو اپنے محبوب کا دھوکہ ہونے لگتا ہے تو عشق حقیقی اور فنا اللہ کی منزل تک پہنچنے کے بعد اگر سالک کو ہر چیز خدا نظر آنے لگے تو اس میں کیا تعجب ہے۔ یہ درحقیقت ایک کیفیت وجدانی اور حالت ذوقی ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ

سالک واقعی خدا ہو جاتا ہے یا ہر چیز واقعی خدا ہو جاتی ہے۔ خدا خدا رہتا ہے ہر شے اپنی جگہ پر ویسے ہی رہتی ہے جیسی کہ عالم واقعے میں ہے۔ صرف اس کو اپنے کمال محویت کیوجہ سے فرق نہیں نظر آتا بلکہ واردات قلبیہ کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے کائنات عالم کے افراد کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے اور توحید اور صرف توحید میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ ہے تاویل وحدت الوجود کی جس پر عقلی فلسفی اور مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

میں نے جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا تجھ کو
جاننے والوں نے کیا جانے تجھے کیا جانا

جامہ بشری میں آنے کے بعد انسان کے نفس کے جتنے مدارج اور ترقی کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ موالید ثلاثہ میں جمادات کی ترقی کو ایک حد تک آنے کے بعد نباتات رد کر دیتے ہیں اور نباتات کی ترقی کو اسی طرح سے حیوانات رد کر دیتے ہیں اور حیوانات کی ترقی کو انسان رد کر دیتا ہے لیکن انسان کی ترقی کو کوئی شے نہیں روک سکتی۔ اس کی آخری ترقی کی سرحد الوہیت سے ملتی جلتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ عبدی اطعنی حتی اجعلک مثلی میرے بندے تو میری ہی عبادت کر تاکہ میں تجھے اپنے مثل بنا لوں۔ یہ ہے انسان کی معراج ترقی کی انتہا کہ انسان پر خدا کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ خدا مثل تو محال عقلی ہے۔ مگر عبادت و ریاضت سے انسان جمال ربوبیت کا آئینہ بن جاتا ہے یہ اپنے اپنے ضبط نفس کی زیادتی اور کمی ہے کہ کوئی اس آئینہ میں اپنی ہی شکل دیکھ کر ہمہ اوست اور

انا الحق کے نعرے مارنا شروع کر دیتا ہے اور کسی کو خود دنیا والے خدا کہنے لگتے ہیں مگر وہ روکتا ہے اور منع کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صوفیاء کرام کے مرشد اول جن کی طرف صوفیاء عظام کا ہر سلسلہ منتہی ہوتا ہے یعنے حضرت علیؑ علیہ السلام ان کو جب نصیریوں نے خدا کہا تو انھوں نے سختی سے منع کیا بلکہ اس پر سخت سے سخت سزائیں دیں جس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس شخص میں جس قدر قوت ضبط اور برداشت زیادہ ہوگی اتنا ہی وہ جمال اور جلال ربوبیت کے آئینہ بردار ہونے کے باوجود بھی اپنی حد میں رہیگا۔ اور ابل نہ پڑیگا۔ اور جس میں عبادت اور ریاضت کی وجہ سے مبدء فیاض کی طرف سے کچھ پرتو پڑا اور ان کی قوت برداشت اور ضبط کمزور رہی وہ بے خود ہو کر جامہ سے باہر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے انبیاء کرام اور اہل عصمت کبھی ہمہ اوست کے مدعی نہیں ہوئے۔ اتنا تو صوفیاء کرام کے سرخیل اور سر برآوردہ حضرات مثلاً حضرت بایزید بسطامی و امام غزالی و مولانا روم وغیرہم میں مسلم ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت وغیرہ سے انسان میں ایک جدید حاسہ پیدا ہوتا ہے جو حواس ظاہری اور باطنی کے علاوہ ہے۔ اس حاسہ کے ادراکات حواس ظاہری اور باطنی کے علاوہ ہوتے ہیں۔ یہی حاسہ جب حاصل ہوتا ہے تو سالک پر حقائق اشیاء کھل جاتی ہیں۔ یہی حاسہ صوفی کو بعد مجاہدہ اور ریاضت حاصل ہوتا ہے اور انبیاء میں بدرجہ اتم پیدائشی ہوتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ انبیاء پر جسقدر حقائق اشیاء واضح ہوں گی اتنی ایک صوفی پر نہیں ہوسکتیں اور انبیاء نے کبھی ہمہ اوست کا دعویٰ نہیں کیا۔

لہذا بقول مولانا روم یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہمہ اوست ایک کیفیت ذوقی اور وجدانی ہے اور آگے بس۔

کہو میاں والا رے! بکیسی پتہ کی کہی جو چیز تمہیں سینکڑوں کی کتابوں کی ورق گردانی اور معنوی چراغ کا دھواں کھانے کے بعد بھی شاذ ہی معلوم ہوتی یا نہ ہوتی اس پر اس بچپنے میں تم خود ہی نہیں واقف ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی محفوظ رکھ سکو گے۔

وحدت ملی اسلامی

درحقیقت توحید ایک ایسا سچا اور پکا۔ صاف اور ستھرا جامع حقیقت نظریہ ہے جس سے اقوام عالم میں وحدت ملی اور شیرازۂ قومی کا واحد نظریہ پیدا ہوتا ہے اور کالے اور گورے سیاہ اور سفید میں بالکل فرق نہیں رہتا۔ جن لوگوں نے قومیت کی بنا پر اوطان پر رکھی ہے انھوں نے اقوام عالم میں تفریق کا ایک ایسا خلیج حائل کر دیا ہے جس سے حریت فکر اور جمہوریت ہمیشہ نالاں اور اپنے اپنے مفاد اوطان کے تابع رہے گی۔ اور توحید کا خط و خال یکساں نظر نہ آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مزاج اقوام کے لحاظ سے توحید میں بھی اختلافات رونما ہوتے چلے آئے۔

فطری مذہب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے

فطرت انسانی چونکہ تمام عالم کی ایک ہی ہے۔ لہذا فطری مذہب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور اس کی بنا پر جو قومیت کی تشکیل ہوگی وہ بھی واحد دکھتا ہوگی۔ یہ فطرت ہی کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی نہج سے ایک طاقتکو

عالم میں کارفرا تسلیم کرتا ہے۔ کوئی مادہ بے شعور کو خالق عالم سمجھتا ہے تو کوئی علت و معلول کو۔ فطرت کو بیدار کرنے والے مذہب اسلام نے اسی کا نام خدا رکھا ہے اور اس کو اس طرح سے واضح کیا ہے کہ اگر دنیا صحیح معنوں میں موحد ہو جائے تو سارے اختلافات باہمی و قومی۔ معاشرتی و اخلاقی وغیرہ وغیرہ ایک قلم رفع ہو سکتے ہیں۔ جب سارے عالم کا خدا ایک ہو گا تو اس کا بنایا ہوا قانون اور دستور العمل بھی سب کے لئے ایک ہی ہو گا اور وہ بلا غرض و غائیت نہ ہو گا۔ ورنہ فعل عبث لازم آئے گا جو شان حکیم کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اپنے الفاظ میں اس حقیقت فطری کو اعجازی رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔ افحسبتم انما خلقنا کم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون۔ کیا تم لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور بے کار خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ یہ استفہام انکاری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم عبث خلق کئے گئے ہو بلکہ تمہاری خلقت کی غرض و غائیت ہے جسکی توضیح دوسری جگہ قرآن مجید میں یوں کی گئی ہے۔ ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون یعنے ہم نے جن و انس کو اپنی عبادت و معرفت کیلئے پیدا کیا ہے اور عبادت کا مفہوم عقلی صرف نماز روزہ وغیرہ ایسے رسمی طریقۂ عمل تک ختم نہیں بلکہ تجردی۔ تاہلی۔ معاشرتی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ ملکی۔ قومی زندگی کو سمیٹتا ہوا حیات ابدی تک منتہی ہوتا ہے لہذا ایسا جامع اور حاوی کل مفہوم عبادت یہی ہو سکتا ہے کہ عبادت حکم اللہ پر عمل کرنے کا نام ہے۔

واہ واہ اباجان! اب تو مجھے معلوم ہوگیا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں؟ آپ نے خوب ثابت کیا کہ میں ایک خدا کا بندہ ہوں اور ملک عدم سے جس وقت اس کی مشیئت مقتضی ہوئی مجھے عالم وجود میں عبادت کے غرض سے لائی ہے لیکن یہ بات رہی جاتی ہے کہ عبادت کے احکام مجھے کیسے معلوم ہوں

نبوت عامہ

ہاں بیٹا یہ سچ ہے۔ یہ بات تمہیں اس تمہید پر غور کرنے سے معلوم ہوگی کہ مقام تکلیف میں ہر مکلف کو خدا کا حکم یا تو اس کو یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ براہ راست اس کو خدا سے تعلق ہو اور بغیر واسطے غیرہ وہ اللہ تعالیٰ سے اخذ احکام کر سکے اس چیز کی ہر مکلف میں صلاحیت نہیں کیونکہ ہم انتہائی مادیت میں اور وہ انتہائی تجرد میں ہے لہذا اب دوسری صورت یہ ممکن ہو سکتی ہے کہ ہمارے اور خدا کے درمیان ایک واسطہ ہو جو ادھر سے احکام لے اور ہم تک پہونچائے کیونکہ واسطے میں یہ چیز قطعی ہوتی ہے کہ جن دو چیزوں میں وہ ربط پیدا کرنا چاہتا ہے ان دونوں سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہو لہذا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ جو واسطہ ہم تک حکم اللہ کو پہونچائے اس میں سے ایک پہلو تجردی اور ایک پہلو مادی ہو۔ کیونکہ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ہم آفتاب کے سامنے کسی صاف شیشے کو لاتے ہیں تو آفتاب کا عکس اس میں نہیں آتا بلکہ شیشے کی لطافت کی وجہ سے اس میں سے پار نکل جاتا ہے لیکن اگر اس کے دوسرے سمت مٹی وغیرہ لگا دی جائے اور آفتاب کے سامنے لایا جائے تو آفتاب کا اثر معہ اپنے عکس کے تیز تر محسوس ہوگا۔ آفتاب اپنی ہی جگہ

ہوگا مگر یہ کثیف مادہ لطیف شیشے کے ذریعہ سے اس کے اثر حرارت کو آئینہ میں منتقل کردیگا۔ یہی وہ دلیل ہے جو اس بات کو بتاتی ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان جو واسطہ ہو اس کا ایک پہلو مادی اور دوسرا روحانی ہو۔ روحانی اور تجردی پہلو سے وہ احکام و انوار الہیہ کا اخذ کرے گا اور مادی پہلو سے وہ اپنے ابنائے جنس یعنی انسانوں میں اس کا نشر کریگا۔ یہاں تک منزل کلام پر پہنچنے کے بعد ہر سلیم العقل کی سمجھ میں یہ بآسانی آگیا ہوگا کہ انسان اور خدا کے درمیان کا واسطہ جس کو مذہبی زبان میں نبی یا پیغمبر کہتے ہیں وہ انسان اور صرف انسان ہی ہو سکتا ہے۔ ملائکہ اور عقول مجردہ یا انسان سے پست درجہ کی جو مادیت میں ہوں نہیں ہوسکتے۔

نبوت عامہ کی مزید توضیح

بیٹے! کیا تم مجھکو یہ بتلا سکتے ہو کہ جب میں یہاں گھر پر کوئی تعلیم دینا چاہتا ہوں تو تم گھبراتے اور پریشان ہوتے ہو لیکن ادھر صبح ہوئی اور اسکول کی گھنٹی بجی اور تم فوراً اپنی کتاب اور تختی لے کر اسکول بھاگتے ہو اور وہاں دیر تک اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ پڑھتے رہتے ہو اور کسی قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں لاحق ہوتی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ ابا جان! وہاں میرا دوست حبیب اور دیگر ہمسن بچے ہوتے ہیں جن کی سنگت میں مجھے لکھنا پڑھنا بار نہیں ہوتا۔

واہ واہ، شاباش۔ تم نے ایک فطری کلیہ کو بتلایا جسکے ہر شے اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے ؎

کند ہم جنس باہم جنس پرواز — کبوتر با کبوتر باز با باز

آؤ اسی سلسلہ میں تمہیں ایک پر لطف حکایت سناؤں۔ تمہارے دادا یعنی میرے والد مرحوم کو ایک زمانہ میں طوطی پالنے کا بڑا شوق تھا۔ مرحوم اس کے سکھانے میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ نانپارہ میں جب میں ان کے ساتھ تھا اکثر یہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے طوطی کے پنجڑے کے سامنے ایک بڑا آئینہ نصب کیا اور پس آئینہ بیٹھ گئے۔ خود جو بولتے جاتے تھے طوطی آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر یہ سمجھتا تھا کہ یہی میرا ہم جنس طوطی بول رہا ہے۔ لہذا بغیر کسی وحشت اور گھبراہٹ کے آسانی سے وہی کلمات رٹتا جاتا تھا۔ خلاق فطرت انسانی نے بھی اسی چیز کو مناسب سمجھا کہ انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ایسا ہی معلم ہونا چاہیے جس سے وہ مانوس ہو سکے۔ اور وہ سوائے انسان کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اس لئے انھیں انسانوں میں سے ایسے اشخاص کو یہ اعتبار زمانہ اپنے جمال و کمال کا آئینہ بنایا جو اس کی طرف سے اخذ تعلیمات کر کے اپنے ابنائے جنس میں عملی نمونہ بنکر نشر کریں۔ نبی کا کلام گو اس کی زبان سے نکلتا ہے مگر وہ آواز قدرت کی آواز ہوتی ہے اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے۔ ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ میرا نبی کبھی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا جب تک کہ میری طرف سے وحی نہ ہو۔

نبی کی شناخت

اب یہ بات رہتی ہے کہ ہم کس طرح سے پہچانیں کہ وہ نبی سچا ہے اور جو احکام ہم کو تعلیم کرتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ہیں۔ اس کیلئے ضرورت ہوئی کہ

لازمی کوئی ایسی نشانی اس کے پاس ہو کہ واقعی وہ خدا کا سچا پیغامبر ہے۔ لہٰذا مشیت ایزدی مقتضی ہوئی کہ ایسی طاقت دے کر ان کو دنیا میں بھیجے جس کے اظہار سے اس کے زمانہ والے عاجز ہوں۔ اسی کو لسان شریعت میں معجزہ کہتے ہیں۔ ارباب ملت میں اس مسئلہ پر بڑا اختلاف ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں۔ میں اس طویل اور عریض بحث میں ایک وجہ جامع پیدا کر کے یوں ختم کر دینا چاہتا ہوں کہ معجزہ عوام کے لئے تو ضرور دلیل نبوت ہے خواص اور اہل باطن کے لئے نہیں کیونکہ جب کوئی شخص دعویٰ نبوت کرتا ہے تو عوام کا تقاضہ ہوتا ہے کہ کوئی دلیل دو۔ وہ کہتا ہے یہ دیکھو میں لو ہے کو موم کر دیتا ہوں۔ یا آگ کو سرد کر دیتا ہوں عصا کو اژدہا بنا دیتا ہوں۔ بہتے ہوئے دریا میں شگاف پیدا کر کے راہ پیدا کرتا ہوں۔ چاند دو ٹکڑے کرتا ہوں ستارہ گھر میں اتار لیتا ہوں۔ یا ازیں قبیل دیگر خرق عادات جب وہ اپنے دعوے کے بموجب صادر کر دیتا ہے تو عوام لاجواب اور مجبور ہو کر اپنے ہار مانتے ہوئے اس کی نبوت پر ایمان لے آتے ہیں۔ کیونکہ عوام اس کے قوائے باطنیہ اور کمالات نفسانیہ سے آگاہ نہیں ہوتے لہٰذا جب تک نبی اپنی قوت کا تصرف اسباب خارجیہ پر کر کے ان کے دلوں پر اثر نہ ڈالے عوام اس کو نبی برحق نہیں سمجھتے۔ مگر خواص اور اہل باطن کیونکہ نبی کے قوائے باطنیہ اور کمالات نفسانیہ سے واقف ہوتے ہیں اس لئے ان کے واسطے ادعائے نبوت نبی کو تسلیم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ کوئی خرق عادت کی ضرورت نہیں ہوتی

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اہل باطن کے لئے
ایک نبی برحق کا ادعا نبوت ہی ان کے لیے معجزہ بن جاتا ہے۔ وہ لوگ
جو مادیات میں گھرے ہوئے ہیں اور اسی رنگ و بو کی دنیا سے حقائق ربانی کو
سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے تو خرق عادات بوجہ مجبوری کو نبی برحق ثابت
کر سکتی ہے لیکن وہ اہل باطن کہ جو اسرار ربانی اور رموز سبحانی سے واقف ہوتے
ہیں ان کو آواز حق کی تلاش رہتی ہے ادھر کسی نبی برحق نے ادعاء نبوت کیا
ادھر ان کا دل لبیک کہہ کر استقبال کے لئے تیار ہو جاتا ہے وہ خرق عادت
کی مجبوری سے سپر انداختہ ہو کر جبریہ نبی کو نبی نہیں مانتے بلکہ آواز حق کے اوپر
ان کا دل بول اٹھتا ہے اور بکمال صدق و صفا اس کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور سچ
بھی یہی ہے کہ خرق عادات کے جھمیلوں میں پھنسنے والے بعض تو ایمان ہی نہیں
لاتے اور بعض اگر ایمان لاتے بھی ہیں تو بہت سی الجھنوں کے بعد جس کی تفصیل
یہ ہے کہ حکما اور ان کے متبعین تو علل اور معلول کے سلسلے میں ایک ایسے قانون
قدرت کے قائل ہو گئے ہیں جس کے خلاف کوئی شبہ کسی وقت حادث نہیں
ہو سکتا لہذا ان کے نظریہ کی بنا پر خرق عادت محال ہے اس کے برعکس اشاعرہ
کسی قانون قدرت کے قائل نہیں لہذا ہر وقت خرق عادت ممکن ہے۔ میری
رائے میں یہ دونوں گروہ افراط و تفریط میں ہیں۔ اس لئے کہ اگر دنیا میں کوئی
قانون عادت نا جاری و ساری نہ تسلیم کیا جائے تو نظام عالم درہم و برہم ہو جائیگا
کوئی معاملہ کسی کی نظر میں قابل اعتبار نہ رہیگا۔ اور اگر فلاسفہ کی تھیوری پر انھیں کے

خود ساختہ خواص اور اثرات تک اشیار کی تاثیر محدود رہے گی تو دنیا کی علمی
ترقی ختم اور جدید انکشافات بے کار۔ پہلے حکما کی تحقیقات میں تو یہیں تک ثابت
تھا کہ نباتات میں سوائے نمود کے کوئی شعور اور ادراک نہیں ہے لیکن جدید
تحقیقات سے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایک گھاس ایسی بھی ہے کہ اگر اسکی
طرف سے کوئی انسان یا حیوان گذرے تو وہ بڑھ کر اسے چمٹ جاتی ہے
اور خون چوس لیتی ہے۔ افریقہ کے جنگلات میں ایسے نباتات پائے جاتے
ہیں۔ نیز دور کیوں جائیے سائنس جدید نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ
آگ و پانی کی خاص ڈگریاں ہیں جن کے بعد وہ برعکس اثر پیدا کرتے ہیں۔
دیکھو انتصار الاسلام علامہ کنتوری۔ ڈاکٹر ہنی مین موجد ہومیو پیتھی کا جو طریقہ
علاج و معالجہ اس وقت عام طور سے رائج ہے اس کا مدار اسی پر ہے کہ
جس چیز میں جو خواص ہیں وہ ایک نمبر پر جانے کے بعد اس سے برعکس
اثرات پیدا کرتے ہیں۔ ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے
کہ اس وقت تک جو خواص الاشیار اور قانون قدرت معلوم ہوا ہے وہ
تشنۂ تکمیل ہے۔ آگے اس میں اور جہاں تک عقل انسانی رسائی کرے اضافہ
ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی احاطہ نہیں ہو سکتا بلکہ ناممکن ہوگا۔ ایسی حالتمیں
کسی خاص قانون کا تسلیم کرنا اور محض اسی کو قانون قدرت قرار دینا نہایت
نامعقول ہے۔ زائد سے زائد صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ عادت جاریہ
جو ہمارے علم میں ہے یوں ہی ہے لیکن خالق کائنات جو حقائق اشیار کے

کماحقہٗ واقف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اشیاء کی ایسی خفیہ اور پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرکے سامنے لائے جو ہمارے علم میں نہ ہوں اور ہم اس کو خرق عادت سمجھیں اسی لئے اہل دانش یہ تفریق کرتے ہیں کہ معجزہ کا تعلق محال عقلی سے نہیں ہوتا بلکہ محال عادی سے ہوتا ہے جو عقلاً تو ممکن ہوتا ہے اور عادتاً محال۔ اور نبی اسی امکان عقلی کو جو عادتاً محال ہے خدا کی دی ہوئی قوت سے عالم وقوع میں لاتا ہے۔ اسی لئے کسی نبی نے اجتماع ضدین اور شریک باری کو اپنا معجزہ نہیں قرار دیا کیونکہ یہ محال عقلی ہیں۔ اس سے قدرت اور فعل خدا کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اور معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہذا یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ معجزہ کا تعلق ممکنات سے ہوتا ہے اور وہ بجائے خود دلیل نبوت ہو سکتا ہے بلکہ اسباب خارجیہ کے ذریعہ سے نبوت برحق کی شناخت کا یہی واحد ذریعہ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے ہر نبی برحق اپنی صداقت کی دلیل میں عوام کے سامنے معجزہ ہی پیش کرتا رہا۔

مذہب عین سیاست ہے

یہاں یہ اور بھی قابل لحاظ ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ نبی کو باوجود اپنی صداقت کے لاجواب دلائل پیش کرنے کے بعد بھی اپنے برسر اقتدار طاقتوں سے ٹکر لینا پڑا جس کے نتیجہ میں زیادہ انبیاء یا تو قتل ہوئے یا دار پر چڑھائے گئے یا دیگر طرح طرح کے مصائب میں زندگی بسر کرتے رہے۔ کم اور بہت کم ایسے انبیاء۔ محض وہ جن کے ہاتھ میں زمانہ کی سیاسی طاقت بھی رہی ہی

اہل سطوت کی چیرہ دستیوں اور مظالم سے محفوظ رہ سکے۔ جیسے حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ وغیرہ۔ لہذا جب ایک مورخ ان حقائق تاریخی پر گہری نظر سے غور کرتا ہے تو لازمی اس نتیجہ تک پہونچتا ہے کہ نبی جو دستور حیات اور ضابطہ زندگی خدا کی طرف سے لے کر آتا ہے اس کا تعلق صرف امور روحانیات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے زمانہ کے سیاسیات سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ برسر حکومت و برسر اقتدار لوگ جن کی سیاست سے نبی کی سیاست متصادم ہوتی ہے اس کے استیصال اور قتل اور خونریزی پر تل جاتے ہیں۔ یہاں پہ وہ لوگ غور کریں جو یورپ کی تقلید میں سیاست کو مذہب سے الگ کر کے پیشوایان مذہب کی تعلیم کا تعلق صرف روحانیت تک محدود رکھتے ہیں۔

ایک سچے اور برحق مذہبی قانون قدرت کا تعلق کبھی صرف آخرت تک محدود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ امور دین و دنیا دونوں پر حاوی ہوگا۔ اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں مذہب عین سیاست ہے اور نبوت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ:۔

ھِیَ رِیَاسَۃٌ عَامَۃٌ فِی اُمُوْرِ الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا یعنی نبوت ایک حکومت عامہ ہے امور دین و دنیا میں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دین بن ہی نہیں سکتا جب تک دنیا کی اصلاح نہ ہو۔ نبی کی غرض بعثت ہی اسی واسطے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے اخلاق و کردار کو خدائی قانون کے سانچہ میں ایسا ڈھالتا ہے کہ ان کی آخرت سدھر جائے اسی وجہ سے ہر نبی اپنے اپنے زمانہ میں مصائب و آلام جھیل کر اس غرض کو پورا کرنے کی

کوشش کرتا رہا۔

عصمت انبیاءؑ

لیکن اگر نبی میں سہو نسیاں اور غلطی یا دیگر بشری کمزوریوں کا امکان ہوگا تو اس کے لائے ہوئے شریعت پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر ہر مسئلہ میں یہ جائز احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ نبی سے اس میں سہو نسیاں یا غلطی ہوئی ہو اور واقعی حکم اللہ ہم تک نہ پہنچے۔ ایسی صورت میں صحیح مقصد تبلیغ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک نبی کو معصوم نہ تسلیم کیا جائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی سے قوت شر صلب کر لی جاتی ہے اور وہ ارتکاب معاصی پر قادر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک کامل انسان ہونے کی حیثیت سے قوت شر اور خیر میں باوجود اپنے پورے پورے اختیارات کے توازن پیدا کرتا ہے اور وہ قوت قدسیہ جو اس میں پیدائشی ہوتی ہے شر پر خیر کو ترجیح دیتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ۔ النبیُ نبیٌ ولو کان صباء بہرحال نبوت مع اپنی عصمت کے انسان کی طفلانہ ترقی کے ساتھ ساتھ اس حد تک بلند ہوئی کہ لولاک لما خلقت الافلاک

ختم نبوت

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ غرض و غائیت خلقت عالم نبی بنا کر بھیجے گئے۔ میں علت ناقصہ کے بیان میں عقلی حیثیت سے ثابت کر چکا ہوں۔ کہ علت نمائی کا وجود ذہنی اور عقلی سب سے پہلے ہوتا ہے اور عالم خارج د

مادیات میں سب سے آخر میں ہوتا ہے۔ جب حضرت سرور کائنات عالم مادیات کی علت نمائی ہوئے اور لقب نبوت ترقی کرتا ہوا آپ کی ذات والا صفات تک پہنچا تو اب اس عہدہ توصیص تھی جو آپ کے بعد کسی دوسرے کو دیا جاتا اس وجہ سے خداوند عالم نے اپنے منصب کا احترام کرتے ہوئے سد باب نبوت کر دیا اور آنحضرت صلعم نے بزبان وحی لا نبی بعدی ارشاد فرما دیا۔

مجھے حیرت ہے کہ زبان عربی سے تھوڑا سا بھی حس و مس رکھنے والے یہ جانتے ہیں کہ لا نفی جنس جب کسی اسم نکرہ کے اوپر داخل ہوتا ہے تو وہ اس اسم کی جنس یعنی حقیقت کی نفی کلی کرتا ہے لہذا لا نبی بعدی کے ارشاد کے بعد نبوت تشریعی یا غیر تشریعی کی تفریق کرنا نہایت لغو اور مہمل ہے۔ لا نبی بعدی میں لا نفی جنس کا نبی اسم نکرہ کے اوپر داخل ہونا جنس نبوت کی نفی کرتا ہے عام اس سے کہ نبوت تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔ اسی وجہ سے امت مسلمہ کے جملہ فرق کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی برحق مبعوث نہیں ہو سکتا یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ضروریات دین میں سے ہے جس کا انکار کفر و الحاد تک پہنچ سکتا ہے۔

نیز آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ بعثت لا تمم مکارم الاخلاق میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مدارج اخلاق کو ختم کر دوں۔ اب یا تو اپنے مدارج اخلاق کو ختم کیا یا نہیں۔ اگر نہیں ختم کیا تو آپ کی غرض بعثت ہی پوری

نہ ہوئی۔ لہذا سرے سے نبوت ہی ختم۔ اور اگر پیدا کر دیا تو جہاں یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ آپ ناقص نہیں بلکہ اکمل ترین افراد انسانیت سے تھے۔ وہاں یہ بھی صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی تعلیم اور شریعت بھی کامل ہے اسی وجہ سے آپ کی ذات سے متعلق قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ انک لعلیٰ خلق عظیم جو خلق رسول خدا کی نظر میں عظیم ہو اس ذات تک جب منصب نبوت پہنچ جائے تو اس کے بعد پھر کون ایسا اہل نکل سکتا ہے کہ اس کو آپ کے بعد عہدہ نبوت عطا کیا جائے اور آپ کی شریعت کے متعلق قرآن کا یوں ارشاد ہے کہ:۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ ظاہر ہے کہ جب اکمال دین اور اتمام نعمت ہو چکا اور خداوند عالم اب کے اسلام سے پورا پورا راضی ہو چکا تو شریعت میں کسی قسم کی تشنگی باقی نہیں ہی جس کو بعد میں آ کر کوئی پورا کرے یعنی خلق مصطفےٰ اور دین اسلام مرتضیٰ کے بعد کسی دوسرے نبی یا دوسری شریعت کی احتیاج نہیں رہتی۔ زیادہ سے زیادہ آنحضرت صلعم کی حیات ظاہری کے بعد تا دوران نبوت انتخاب ایک حافظ شریعت کی ضرورت یقیناً عقلی تجویز کرتی ہے۔ جو نبی کی طرح سے معصوم یا محفوظ عن الخطا ہو تا کہ شریعت الٰہی کا خط و خال دست و برد زمانہ یا خواہشات انسانی اور اغراض ذاتی کا شکار نہ ہو سکے۔ اب رہ گیا یہ امر کہ حضرت ختمی مرتبت اور آپ کا زمانہ نبوت اس کے اثبات کی بہت سی دلیلیں ہیں۔ میں یہاں صرف ایک ایسی دلیل پیش کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت بھی ہر ایک شخص کے

ہاتھ میں ہے اور ہر کوئی کھرا کھوٹا پرکھ سکتا ہے۔ آنحضرتؐ جس وقت مبعوث بہ رسالت ہوئے اس وقت عربی ادب اس قدر معراج کمال کو پہنچا ہوا تھا کہ شعرائے زمانہ اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے دیگر اہل عالم کو عجم یعنی گنگ کہتے تھے اور اپنے کمال پر اتنا ناز تھا کہ خدا کو بھول گئے تھے اور یہ حالت پہنچ چکی تھی کہ ذوق سلیم اور وجدان مستقیم رکھنے والے ان کی سحر بیانی اور جادو نگاری کی وجہ سے ان کے اشعار کو سجدہ کرتے تھے۔ ایسے باکمال اہل زمانہ اور یگانہ روزگار لوگوں میں عرب کا ایک یتیم مکیہ جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ بڑھ کر اپنی نبوت کا اعلان کرتا ہے اور اثبات نبوت میں وہی فصاحت شکن معجزہ پیش کرتا ہے جس کے اوپر اہل عرب کو ناز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کمال کو کچھ اہل کمال ہی پہچانتے ہیں اور حقیقت سر چڑھ کر بولتی ہے جس وقت آنحضرت نے خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے قصیدوں کے ذیل میں "انا اعطینک الکوثر" کا سورہ لٹکا دیا اور عرب کا خدائے سخن شاعر قصیدوں پر اصلاح دیتا ہوا جب اس سورہ تک پہنچا تو اس کے نیچے یہ عبارت لکھ دی "لیس ہذا من کلام بشر" کیونکہ وہ فن ادب کا کامل تھا اس واسطے اسے پتہ تھا کہ انسانی حدود کمال کی معراج کہاں ختم ہوتی ہے اور کمال سے سرحد اعجاز شروع ہوتی ہے جس پر قدرت حاصل کرنا بشری طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے بجائے کچھ اصلاح کرنے کے یہ اعتراف کر لیا کہ یہ میری بس سے باہر ہے۔ لیکن واہ رے سخن سنجی اور خود اعتمادی بلکہ کمال اعتمادی کہ اس بات کا بھی اپنی تحریر میں اظہار کر دیا کہ میں وہ باکمال ہوں کہ زبان عربی میں مجھ سے زیادہ کوئی بشری کمال نہیں حاصل کر سکتا لہٰذا حسن عبارت یہ

میں خط نسخ نہیں پھیر سکتا وہ لامحالہ حدود بشریت سے خارج کلام ہے۔ کسی زبان کے ادیب یا انشاپرداز کا یہی بہترین کارنامہ ہے کہ وہ اسی زبان کے روزمرہ اور اصطلاحات کو اس طرح سے برمحل اور باموقع صرف کرے کہ اس میں کسی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہ ہو۔ ہر زبان میں ایسے باکمال ادباء و شعراء گذرے ہیں جو لوگوں کی نظر میں یگانہ روزگار سمجھے گئے۔ اگر فردوسی کا شاہنامہ فارسیت کی جان ہے تو شکسپیر کے ڈرامے انگریزیت کے روح رواں ہیں اور سبعہ معلقہ عربیت کا نچوڑ ہیں اور انیس و دبیر، سودا و میر، غالب وغیرہم کی شاعری اردویت کی بنیاد ہو لیکن حالات اور واقعات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان باکمال ادباء و شعراء نے باوجود اپنے کمال میں ید طولی حاصل کرنے کے کبھی تحدی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کبھی کوئی مصنف یا مؤلف اپنی تصنیف یا تالیف میں تاقیامت تحدی کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک باکمال پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا کوئی شخص کسی زمانہ میں کسی کمال میں کتنی ہی ترقی حاصل کرے مگر احاطہ قوت بشری نہیں کر سکتا اور اگر کبھی کسی نے ایسا کیا تو فن کمال کی رگ حمیت پر ایک نشتر لگتا ہے۔ لہٰذا اس کا جواب ہی نہیں بلکہ بہتر تصنیف و تالیف اہل کمال پیش کر کے اس کے دعوے کی رد کر دیتے ہیں۔ یہ دعویٰ تحدی کلام تو وہی ذات پیش کر کے کامیاب ہو سکتی ہے جو خالق بشریت ہو اور انسان کی انتہائی قوت پرواز سے واقف ہو۔ ؎

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

اسی وجہ سے خداوند عالم نے آنحضرت کے ذریعہ سے اپنا کلام پیش کر کے بانگ دہل

اہل عالم کو یہ چیلنج دیا کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ لاؤ میرے ایک سورۃ کا جواب۔ اور ذرا کلام کی آمد اور دعوے کے زور کو ملاحظہ فرمایئے فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی اعدت للکافرین کہ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے اور یقیناً ہرگز نہیں کر سکتے پس اس آگ سے ڈرو جو کفار کیلئے مہیا کی گئی ہو۔ معاذ اللہ تاکید پر تاکید اور نفی پر نفی یہ کسی انسانی دماغ کا گھمنڈ اور بشری دست و بازو کی تگ و دو ہو سکتی ہو۔ وہ تو جانتا تھا کہ کلام مجید تو درکنار جو باہتمام خاص معجزنما صورت میں پیش ہی کیا گیا تھا۔ میری بنائی ہوئی تو ہر چیز ایسی ہی ہے کہ دنیا اس کا مثل نہیں پیش کر سکتی۔ درخت کے ہرا یک ورق اور سبزے کی ہر ہر پتی اور اس کا جاذب نظر ہرا پن اور چھوٹی سی چھوٹی پتیوں میں باریک سے باریک رگ و ریشے اور ان میں نباتی روح کا دوڑنا اور جزو و کل میں یکساں خواص و تاثیر کا موجود ہونا اپنی زبان بے زبانی سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ فاتو من مثلہ لاؤ میرا مثل۔ سائینس کتنی بھی ترقی کر جائے اور انکشافات جدیدہ کے کمالات جسقدر بھی بلند ہو جائیں جب وہ آج تک گھاس کی ایک پتی کا بھی جواب نہ لا سکے تو قرآن کا کیا جواب لائینگے۔ یہی ایک معیار ہو خداوند عالم کی مصنوعات اور مخلوق کی مصنوعات میں خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کا کبھی جواب نہیں ہو سکتا اور مخلوق کی بنائی ہوئی چیز کا جواب ممکن ہو اسلامی تاریخ نے نہایت دیانت سے تمام ان کلاموں کو پیش کر دیا ہو جو آج بھی کوئی صاحب الرائے اور اہل ذوق دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہو کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کا کیا وزن ہے۔ ایک مرتبہ عرب کے چار باکمالوں نے قرآن کے چار حصے کر کے ایک ایک حصے کا جواب تیار کرنا اپنے ذمہ لیا اور یہ تہیہ کیا کہ سال بھر کے بعد ہم چاروں اکٹھا ہو کر اپنے اپنے حصہ کا جوب

ایک دوسرے کے سامنے پیش کرینگے۔ سال کے بعد جب وہ یکجا ہوئے تو کسی ایک نے کہا کہ بھائیو میں قرآن پڑھتے ہوئے جب طوفان نوح کے قصہ پر پہنچا اور غیض الماء واستوت علی الجودی کے جملہ پر غور کیا تو میرا قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں لاجواب ہو گیا۔ دوسرے نے کہا کہ میں فلاں آیت تک پہنچا اور لاجواب ہو گیا۔ یوں ہی چاروں سپر انداختہ ہو گئے۔ اسی وقت کسی طرف سے جناب صادق آل محمد کا گذر ہوا اور آپ نے قرآن کی اس آیت کی تلاوت کی کہ لئن اجتمعت الجن والانس علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا۔ اگر تمام جن والنس ملکر اس بات کی کوشش کریں کہ سارے قرآن کا جواب لاسکیں اور آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں۔ جب بھی قرآن کا جواب نہیں لا سکتے۔ اللہ نے اپنے دعویٰ پر قدرت کا اعتماد کہ پہلے سارے قرآن کا جواب طلب کیا اور جب دنیا اس سے عاجز ہوئی مطالبہ کو سبک کر کے صرف دس صورتوں کا جواب مانگا۔ فاتوا بعشر سور الخ۔ اور جب اس سے بھی لوگ عاجز رہے تو اور مطالبہ کو ہلکا کیا اور یوں کہا فاتوا بسورۃ من مثلہ کہ اچھا اگر تم پورے قرآن کا جواب نہیں لا سکتے دس سوروں کا جواب نہیں لا سکتے تو صرف قرآن کے ایک چھوٹے سے چھوٹے سورہ کا جواب لاؤ۔ اور جب اس کا بھی جواب نہیں ہو سکا اور ان اہل زبانوں سے نہ ہو سکا تو آج کیا کوئی مثل پیش کرے گا۔ قرآن کی جو آواز آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے صحرا عرب میں گونج کر سارے عالم میں پھیل گئی وہ آج بھی اسی طرح سے ہے۔ آج بھی قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ لاؤ میرا مثل۔ جب تک قرآن کا جواب نہ ہوگا

اس کا معجزہ ہونا مسلم ہے یہ ایک ایسا زندہ اور جاری معجزہ ہے جو اپنے لانے والے ہوئے نبی کی نبوت کی تصدیق ہر زمانہ میں کرتا رہیگا۔ جب تک قرآن بشکل اعجاز دنیا میں موجود ہے۔ آنحضرت صلعم کا دور نبوت ممتد اور منجر جاری رہیگا اور چونکہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کا جواب کبھی ممکن نہیں لہذا قرآن کا جواب بھی کبھی ممکن نہیں اور جب کبھی اس کا جواب ممکن نہیں تو کبھی اور کسی زمانہ میں ان کی نبوت کا دور منقطع نہیں ہو سکتا جس کی ایک معمولی حد قیامت ہے۔ قرآن کا معجزنما شکل میں دنیا میں باقی رہنا جہاں ہر زمانہ میں آپ کی نبوت کو ثابت کرد ہا ہے وہاں کسی دوسرے نبی کی نبوت کا بھی انکار کر رہا ہے۔ عام اس سے کہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔

تحریف کی معقول حقیقت

اچھا ابا جان! خوب۔ چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار۔ اس معقول استدلال اور بیان سے تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کمی اور زیادتی کرنا بشری قوت سے باہر ہے۔ پھر کیوں لوگ تحریف کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ہاں بیٹے! تمہاری سمجھ میں خوب آیا۔ نتیجہ تو یہی نکلتا ہے جو تم سمجھے ہو لیکن قرآن کے معجزہ ہونے کے ذکر میں اگر تم نے اس مسئلہ کو بھی چھیڑ دیا ہے تو دوسری حیثیت سے اس پر بھی فرقہ وارانہ سطح سے بلند ہو کر روائیت اور درائیت کی روشنی میں جامع اور معقول نظریہ پیش کئے دیتا ہوں۔

ختم نبوت پر ایک نئی دلیل

آج دنیا کے سامنے نہ داؤد علیہ السلام کی انگلیاں ہیں جو لوہے کو موم

کر دیتی تھیں۔ نہ ید بیضا ہے نہ عصائے موسوی جو مشعل راہ اور اژدہا بن سکے۔ نہ دم عیسیٰ ہے جو مردوں کو زندہ کر سکے۔ ازیں قبل دیگر انبیاء کے معجزات نبی کے گذر جانے کے بعد وہ بھی ختم ہو گئے لیکن آنحضرت صلعم کی نبوت کیونکہ آخری نبوت تھی اس وقت کی کمی پوری نہیں ہو سکتی تھی اس واسطے قدرت نے آپ کی اثبات نبوت میں بڑا اہتمام کیا۔ جتنے معجزات انبیاء ماسلف میں چھٹکے ہوئے پائے جاتے تھے ان کو مزید اضافہ کے ساتھ آپ کی ذات ستودہ صفات میں جمع کر دیا تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اکثر و بیشتر آپ کے حالات زندگی خرق عادات سے مملو ہیں جن کی اگر تقسیم عقلی کی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ حصول علم و ادراک کا ذریعہ عوام میں صرف حواس خمسہ ظاہری ہیں اس لئے آپ کے معجزات حواس خمسہ پر لئے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ لوہے کو موم کرتا ہوا دیکھ کر خود آنکھ والا بلا واسطہ اور نابینا بالواسطہ غیر ایمان لا سکتا ہے معجزہ اپنی حجت میں کافی ہے تاہم اندھے کو ایک عذر لنگ رہ سکتا ہے کہ میں نے تو صدور معجزہ دیکھا ہی نہیں۔ میں کیسے نبی پر ایمان لاؤں۔ اس طرح کے اعذار جب تک دور نبوت دیگر انبیاء کا ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک کے بعد دوسرے انبیاء کے معجزات پورے کرتے رہے۔ لیکن اب جبکہ آنحضرت تک آتے آتے سلسلہ نبوت ختم ہو رہا تھا قدرت نے آپ کے معجزات حواس خمسہ پر بانٹ کر اس قسم کی کمی کی بھی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ مثال کے طور پر آنکھ سے تعلق رکھنے والا معجزہ آپ کا شق القمر۔ لیکن اندھا کیسے ایمان لائے کیونکہ اس کا حاسہ بصر مفقود۔ لہذا

اس کیلئے قوت سامعہ سے تعلق رکھنے والا معجزہ آپ کا جحت ہو سکتا ہے وہ یہ ہے
کہ آپ جب سنگ ریزوں کو بہ ارادہ اظہار اعجاز ہاتھ میں لیتے تھے تو وہ باواز
بلند تسبیح کرنے لگتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بہرا بھی ہو تو اس کے لئے قوت ذائقہ
سے تعلق رکھنے والا معجزہ کام دے گا وہ یہ کہ ایک کاسہ شیر وایک ران
گوشت سے بسا اوقات سینکڑوں آدمی بلکہ ایک لشکر تک کو شکم سیر کر دیتے
تھے لیکن اگر کسی کی قوت ذائقہ بھی سلب ہو گئی ہے تو قوت شامہ سے تعلق
رکھنے والا معجزہ کام دے گا وہ یہ کہ آپ جس گلی سے گذر جاتے وہاں تین
دن تک جم کر خوشبو رہتی تھی اور آنے جانے والے کہتے تھے کہ محمد عربی اس
راستے سے گذرے ہیں۔ لیکن اگر کسی کی قوت شامہ بھی مفقود ہو چکی ہے تو کم سے
ہر زندہ آدمی کے لئے قوت لمس کا ہونا ضروری ہے اس سے تعلق رکھنے والا معجزہ
آپ کا یہ ہے کہ آپ نرم زمین پر چلتے تھے تو نقش پا نہ ابھرتے تھے اور سخت زمین
پر چلتے تھے تو نقش پا ابھر آتے تھے۔ نرم زمین پر چلنا اور نقش پا کا نہ ابھرنا یہ اعجاز،
سخت زمین پر چلنا اور نقش پا کا ابھر آنا یہ اعجاز اس تفصیل کے بعد اجمال یوں
عرض کر دوں کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر چلتے ہیں کچھ سر
جھکا کر چلتے ہیں۔ سر اٹھا کر چلنے والوں کے لئے شق القمر کا معجزہ۔ سر جھکا کر چلنے
والوں کے لئے نقش قدم کا معجزہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آنحضرت صلعم
کے بعد اگر کسی اور نبی کو بھیجنا تھا تو خداوند عالم نے اپنی سنت جاریہ کیخلاف
اتنا اہتمام (معاذ اللہ) لایعنی کیوں کیا۔ اگر فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ درست ہے

اور حکیم علی الاطلاق سے عبث اور مہمل امور کا صدور نہیں ہو سکتا تو اس اہتمام خاص
کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے بعد سدباب نبوت کر دینا مقصود تھا
اسی لئے ہر پہلو سے آپ کی نبوت کا اثبات کیا گیا تاکہ کسی قسم کی تشنگی نہ رہے۔ اور
ہر پہلو سے تکمیل کی پوری کر دی جائے اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ آخری
نبی ہوئے تو آپ کی لائی ہوئی شریعت بھی آخری اور فیصلہ کن ہوگی۔ اس
لئے جو دستور العمل اور ضابطہ آپ لے کر آئے تھے اس کی بقا میں بھی اہتمام
خاص ہونا چاہیے۔ اگلے انبیاء پر جو صحف اور کتب نازل ہوئے اس کا
مفہوم تو خدا کی طرف سے ہوتا تھا لیکن انبیاء اپنی عام بشری زبان میں اسے
الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا رہا کہ ان انبیاء کے بعد دست و
برد زمانہ یا متبعین کی خواہشات ان میں تغیر و تبدل پیدا کرتی رہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ زبور اور توراۃ اور اناجیل کے صحیح نسخے آج ڈھونڈنے سے بھی نہ
ملیں گے۔ یہ سلسلہ نزول صحف و کتب اگلے انبیاء تک تو درست تھا کیونکہ
ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا رہا اور تعلیمات الہیہ میں جو کمی ہوتی رہی اس
کو پورا کرتا رہا لیکن جب دور نبوت خاتمہ پر آیا تو ایسی کتاب نازل کرنے
کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں مفہوم کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی اعجازی
رنگ میں منزل من اللہ ہوں۔ تاکہ خواہشات انسانی اس میں کسی قسم کی کمی
تو اس لئے نہ کر سکیں کہ سلسلہ اور اسلوب میں فرق پیدا ہو کر حذف اور جوڑ
نمایاں رہے اور زیادتی اس لئے ممکن نہ ہو کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نظر آئے

اسی لئے قدرت نے آخری نبی کی آخری شریعت کی آخری کتاب پر اعجاز کے پہرے لگا دیے تاکہ کسی قسم کی تحریف قیامت تک ممکن نہ ہو۔ یہ ہے مقصد انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔ رہ گیا یہ امر کہ اسلامی کتب میں کہیں کہیں بعض روایات احاد اور صفات تحریف کے نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے انتقال کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اپنی پہلی فرصت میں تنزیلی شکل میں معہ شرح و تفسیر قرآن کو جمع کر کے پیش کیا۔ لیکن دربار خلافت میں بعض مصالح وقتی کی وجہ سے وہ قبول نہیں کیا گیا۔ آخر خلافت ثالثہ تک آتے آتے قرآن میں بہت زیادہ اختلافات رونما ہونے لگے لہذا حضرت عثمانؓ نے زید ابن ثابتؓ کو جمع قرآن کا حکم دیا۔ اور جب انھوں نے متن قرآن جمع کر کے پیش کیا تو وہی قرآن تمام ممالک اسلامیہ میں رائج کیا گیا جو اس وقت تک جاری و ساری ہے۔ یہ ترتیب اگرچہ نزولی نہیں ہے مگر عیون الفاظ قرآن بعینہ وہی ہے جس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ممکن تھی نہ کی گئی۔ اسی وجہ سے ائمہ اسلام اسی سے تمسک و توسل کا حکم دیتے رہے۔

نزول قرآن کے ساتھ ساتھ رسول کریم صلعم نے جو اپنے زمانہ میں شرح بطور تفسیر لکھوا دی تھی چونکہ زید ابن ثابت نے متن قرآن کے ساتھ ساتھ جمع کرنے میں اس کو حذف کر دیا تھا اسی لئے بعض رواۃ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ قرآن میں تحریف کر دی گئی۔ انھیں وجہ سے روایات تحریف ضعیف اور ناقابل عمل سمجھے جاتے ہیں اور سواد اسلام بلکہ جملہ فرق اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ

قرآن موجودہ کل کا کل یہی منزل من اللہ ہے اس کے لفظوں میں کسی طرح کی تحریف نہیں ہوئی اور نہ بغداد استدلال سابق لفظوں میں کسی طرح کی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے اس لئے کہ قدرت نے قرآن کو جامع اعجاز بنایا ہے اور اسی پر تحدی کے پہرے بیٹھے ہوئے ہیں اور اسی کی مثال لانے سے دنیا عاجز ہے۔ میرے خیال میں رواۃ قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے نہایت دیانت سے تمام رطب یابس کو جمع کر دیا اور اہل الرائے کو اس بات کا موقع دیا کہ جمع و تعدیل کر کے کھرے اور کھوٹے کو پرکھ سکیں یہ قرآن ہی کی معجز نما کرشمہ سازیاں ہیں جس نے اونٹ کی مہار تھامنے والوں کے ہاتھ میں زمام حکومت دیدی اور غلاموں کو تخت شاہی عطا کیا۔ عرب ایک قرآن ایسا بیش بہا دستور حیات اور ضابطہ زندگی لے کر اقطاع عالم میں پھیل گئے اور دم کے دم میں سارے عالم پر چھا گئے کون کہتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ ان نہتے اور خانہ بدوش مسافر عربوں کے پاس دیگر ممالک میں پہنچکر سوائے قرآن اور اس کی تعلیم کے کیا تھا جس نے سلطنتوں کو مسخر کر لیا۔ زندگی کی دشواریاں اور حیات کی پر پیچ راہیں اپنی تشنگی کو دور رکھنے کے لئے اسی قرآن کو اپنا واحد حل سمجھکر حلقہ بگوش اسلام ہوئیں اور سلطنتوں نے اپنا تاج و تخت پائے اسلام پر ڈالکر سکون ابدی حاصل کیا۔

جملہ فرق اسلام کیلئے ایک جامع فقہ کی تشکیل

لیکن جب اور جس قدر مسلمانوں پر ملوکیت اور شاہنشاہیت غالب

آتی گئی۔ ان میں تشطط اور اختلافات دو نما ہوتے رہے اور اختلافات انظار سے فقہی مسائل میں چار، پانچ مصلے پیدا ہو گئے۔ لیکن مقام عمل میں جملہ فرق ہائے اسلام انہیں سے تمسک کرتے چلے آئے ہیں۔ لہذا پتہ چلتا ہے کہ امر حق انہیں مصلاء خمسہ میں دائر اور موجود ہے۔ مدبر اور بالغ النظر سلاطین اور اہل اسلام اپنے اپنے زمانہ میں وحدت ملی سے ان جزئی اور فروعی اختلافات کو دور کرنے کے لئے بھی سوچتے رہے مگر حالات سازگار نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ زمانہ نے کروٹ بدلی اور دنیا شاہنشاہیت و اشتراکیت اور جمہوریت سے بھی اپنا سکون حیات حاصل نہ کر سکی۔ دنیا کے دیگر قوانین و دستور ملکی اور انتظامی کے متعلق تلخ تجربات کے مقابلہ میں آزمائش کے لئے قانون اسلام پیش کیا جاتا ہے مگر ارباب اقتدار کی طرف سے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ اسلام کے مختلف فرقوں میں سے جس فرقہ کا قانون رائج کیا جائے گا خود دوسرے فرقہ کے مسلمان ہی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ چہ جائیکہ دیگر اقوام عالم۔ اس لئے اس کا واحد حل جو ایک عرصہ سے میرے دماغ میں گشت کر رہا ہے اور جس کو کسی حد تک عملی جامہ بھی پہنا چکا ہوں۔ یہ ہے ایک مصلاء اربع کے مجموعہ سے ایک فقہ تیار کی جائے جس کے مسائل ایسے جامع اور ہمہ گیر ہوں کہ جو مصلاء اربع میں سے کم از کم کسی ایک مصلے کے ضرور مطابق ہوں اور پیروان فقہ جعفری کے لئے بھی قابل قبول ہو سکیں۔ اگر مسلمان اس خیال سے متفق ہوں اور سہولتیں مہیا ہو سکیں تو گو چھوٹا منہ اور بڑی بات ہو گی۔ میں اس خدمت کو انجام دینے کو تیار ہوں

یہ کوشش اگر بہ اتفاق فرق اسلامی تکمیل کو پہنچ گئی تو میرا خیال ہے کہ ایک بڑی حد تک اسلامی نظام کو قبول کرنے میں جو روکاوٹ پیدا ہو رہی ہے وہ دور ہو جائے گی۔

امید ہے کہ اصحاب ذوق اس مسئلہ پر بلند حوصلگی اور وسیع النظری سے اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے تاکہ میرا دماغ مزید روشنی حاصل کر سکے۔

مطبوعہ محمد گوامی ریکی لیکٹرک پریس آباد لکھنو نمبر ۔۔۔
۱۹۵۳ء